نئی بیمارِی

مہندر ناتھ

عبدالحق اکیڈیمی

اشاعت منزل۔ اردو گلی۔ حیدرآباد دکن

تعداد طبع

(۱۵۰۰)

دسمبر ۱۹۴۵ء

قیمت

(عصال)
۴/

فہرست مضامین

صفحات

(۱)	نئی بیماری	۹
(۲)	برف	۳۳
(۳)	وحشی	۶۱
(۴)	ہمالیہ کی چوٹی	۸۳
(۵)	دہلیز	۹۵
(۶)	شادی کے بعد	۱۲۷
(۷)	دیوار	۱۴۵
(۸)	میری آواز	۱۶۵
(۹)	کاش وہ بیوقوف ہوتا	۱۷۹

پڑھنے والوں سے

چمنستانِ اردو میں جو غنچے پھول بن کر مسکرائے، اور جن کی مہک نے مشامِ جاں کو معطر کیا ان میں سے ایک مہندر ناتھ بھی ہیں، دورِ حاضر کے ادیبوں میں وہ ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں مہندر ناتھ کے آرٹ کا سب سے بڑا کمال، مشاہدے کی گہرائی، اندازِ بیان کی لطافت، اور پلاٹ کی حسین و جمیل ندرت ہے جو انھیں اپنے ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے ان کی کہانیوں میں فکر کی بلندی، تخیل کی رنگینی، زبان کی چاشنی کا ایسا ایسا خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے جو اپنے پڑھنے والوں کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑتا، وہ اپنے افسانوں میں زندگی کے اُن حقایق کو پیش کرتے ہیں کہ جن کی طرف سے انسان نے آنکھیں بند کر رکھی

ہیں وہ اپنے ادب میں سماج اور معاشرت کے اُن ناسوروں کو چھیڑتے ہوئے گھر جاتے ہیں کہ جو انسانیت کے لیے بدنما دھبہ ہیں۔

ادارہ عبدالحق اکیڈیمی اِس بلند پایہ ادیب کے نو افسانوں کو اس مجموعہ صورت میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے، یوں تو اچھوتی فن کاری اور رسیلے الفاظ کا استعمال مہندر کے ادب کی جان ہے، لیکن یہ افسانے ادب اردو کے گوہر گراں مایہ ہیں۔ کیونکہ ان میں مصنف کی تخیل بالکل انفرادی اور انوکھی ہے۔

عبدالحق اکیڈیمی کا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے کہ وہ آپ کے سامنے، اچھے ادیبوں، بلند پایہ مفکروں کے ایسے ادب و فکر کو پیش کرے جو بلند سے بلند تر ہو، خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہ سعی ملک میں مشکور ہوئی اور اہلِ نظر نے ہماری مطبوعات کو پسند فرمایا اور خصوصیت سے ہماری کتابیں ادبی حلقوں میں پسندیدگی نظروں سے دیکھی گئیں، زیرِ نظر کتاب بھی ہماری مطبوعات میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قارئین بھی اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں گے۔

علی شبر حاتمی

نئی بیماری

گارگی کی خوابیدہ آنکھوں میں گزری ہوئی رات کی
تصویریں اچھلنے لگیں، کانچ کے چھوٹے چھوٹے گلاس جاپانی کھلونوں
کی طرح ناچنے لگے، رنگین میز جس کا ہلکا آسمانی رنگ بال روم کی
دیواروں سے ملتا تھا۔ اُس کی نیلگوں آنکھوں میں سمانے لگا، کہنیوں
کو نہایت احتیاط سے میز پر رکھنا، اور کچھ جھکے جھکے رہنا، اور ریتنا
پاش اور آرزومند نگاہوں سے امجد کو دیکھنا۔ بیرا ایک ــــ اور
دو "گملاٹ" لاؤ۔ مت پیو گارگی، اور پھر امجد کا اُس کی طرف دیکھنا
حسین، جوان، خوب صورت، آنکھوں میں شباب کا نشہ جیسے
کتنے ہی گھونٹ پی لیے ہوں۔ دیر تک اُس کی نشیلی، رس بھری
نظروں کی طرف دیکھتے رہنا۔ یہاں تک کہ سارے جسم میں کپکپی

دوڑ جاتی، آنکھیں، ناک، اور کان سرخ ہو جاتے، اور پھر گارگی محسوس کرتی کہ اُس کا جسم گرمی سے انگارہ ہو رہا ہے، اور رخساروں میں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں - بیرا - پانی کا ایک گلاس! گارگی گالوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی، پانی کے سرد قطرے اُس کی روح کو تسکین بخشتے لیکن پھر کسی کی شہد کی سی میٹھی سانس اُس کے نتھنوں سے ٹکراتی، اور کسی کی لذت بھری آواز اُس کے کانوں میں آتی، ایک پیگ اور مائی ڈرلنگ، کانچ کے گلاسوں کا آہستہ سے آپس میں ٹکرانا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ان کے ہونٹ ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں، اور پھر ایک مدھم نقرئی آواز —— جیسے اندھیرے میں کسی کی انگلیاں ساز کی تاروں سے الجھ جائیں، اور ایک مبہم، غیر فانی، لطیف نغمہ بلند ہو کر رہ جائے - وہ نغمہ جو سر سے لے کر پاؤں تک پھیل جائے، اور پھیلتا جائے اور دیر تک جسم کے مساموں میں جھنجھناتا رہے -

---

یہی زندگی تھی، جسے گارگی نے اپنا لیا تھا، بال روم جس کے تصور سے دل میں نغمے بیدار ہونے لگتے ہیں، گارگی کے ذہن میں تھرکنے لگا، دھیمی دھیمی روشنی، کبھی کم اور کبھی زیادہ

بالکل اسی طرح جیسے موت ہو۔ اور کبھی زندگی، اور پس منظر میں بے تھیون کا سریلا نغمہ۔ کبھی مدھم سروں میں، اور کبھی کبھی تیز۔ اور جب موسیقی عروج پر پہنچتی، تو اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی، اس کے جذبات میں ایک طوفان آجاتا، صاف، شفاف، بلوریں، اور چمکتے ہوئے فرش پر گلنار کی کے خوب صورت پاؤں جنبش کرتے، شوخ، بھڑکیلے لباس، برہنہ ٹانگیں، گول اور گداز بازو، دہکتے ہوئے رخسار، گملٹ کے نشے سے لبریز احمریا آنکھیں، مرمریں ہاتھوں کی لرزش، مخملی باہوں کا رقص، ابھرے ہوئے نقطے۔ اور ٹھہرا ہوا ہجوم، سانسیں آتشیں، آنکھوں میں ایک پیاس ایک تشنگی، باتوں میں بے باکی، حسن کا چرچا، لبوں کی تعریف گھنگریالے بالوں کا پیچ و خم، اور یکایک ہجوم کا جنبش میں آجاتا جیسے سوئے ہوئے سمندر میں لہریں بے دار ہوجائیں جیسے کنواری لڑکی کے جسم سے کسی غیر کا ہاتھ مس ہوجائے، نائلوں کا ہلنا، پس منظر میں موسیقی کے تاروں کا لرزنا، گول گول ٹخنے، سفید نرم اور ملایم ایڑیوں کا ابھرنا، جیسے نوجوان لڑکیوں کو جھانک رہے ہیں، کہ میں کسی کا ہاتھ جس سے ملنے کے لیے دل اکثر ترستا رہتا ہے، اور ناچنا، تھرکنا، فضا سانسوں سے بوجھل ہورہی ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضا میں افیون کا نشہ ہے' اور یہ نشہ جسم کی نس نس میں تحلیل ہو رہا ہے' کمر کے گرد گرفت مضبوط ہو رہی ہے' نزدیک ——— نزدیک اور نزدیک۔ یکایک دونوں کو نے منطبق ہو جاتے ہیں' روحوں کا ملاپ ——— حیات انسانی کا معراج' ناچتے ناچتے تھک جانا' تھرک تھرک کر چور ہو جانا کسی کی مدھم' سریلی آواز کانوں کے ریشمی پردوں سے ہم آہنگ ہے ہاتھ ابھی تک کمر کے گرد' انسان کا ازلی ہاتھ' عورت کی ازلی کمر کے گرد۔ گارگی (I love you darling) اور آواز مدھم ہوتی جاتی ہے' حتیٰ کہ سنائی نہیں دیتی' ناچتے ناچتے اعضا ڈھیلے ہو جاتے ہیں' جیسے پتنگ کی ڈور سے مانجھا اتر جائے' اور پھر موٹر فراٹے بھرتی جارہی ہے' نیم جان رات کے ٹھنڈے آنسوؤں سے گارگی کے گالوں کی حدت کم ہو جاتی ہے' سردی ——— لحاف ——— گرم بستر ——— اور صبح۔

گارگی نے انگڑائی لی۔ اور سر کو ایک طرف جھٹک دیا۔ ریشمی بھورے بال شانوں پر بکھر گئے' پھر گارگی نے تکیے کو گول کر کے سر کے نیچے رکھا۔ اور آنکھیں کھول کر کمرے میں چاروں

طرف نگاہ دوڑائی، پلکیں نیند کے بوجھ سے کھلتی نہ تھیں، اور سر میں ابھی شراب کا ہلکا ہلکا نشہ تھا، سورج کی اولیں کرنیں رنگین شیشوں سے ٹکراتیں، اور اندر آنے کی ناکام کوشش کرتیں، گارگی نے ایک جمائی لی، اور ریشمی چادر پھر اوڑھ لی، اُس کے جسم پر ایک پتلی سی ساڑی تھی۔ گارگی نے سوچا۔ اگر یہ ساڑی بھی نہ ہو۔ تو پھر کیا ہو گا میز پر پڑا ہوا کیوپڈ کا بت اس کی طرف مسکراتا ہوا نظر آیا۔ بت کے دل کش خطوط کو دیکھ کر وہ پھر خیالات کے سمندر میں ڈوب گئی، اور پیرس کی ایک رات اسکی آنکھوں میں گھوم گئی، اس رات کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی، اسی رات تو اُس کی زندگی کا آغاز ہوا تھا باہر سیاہ اور بھیانک رات تھی، اور ہال کے اندر جگمگاہٹ ——— روشنی، ہر طرف روشنی، زندگی، چہروں پر شگفتگی، آنکھوں میں تر و تازگی ہر طرف مسکراہٹیں، قہقہے ——— انسان ازل سے ننگا پیدا ہوا ہے، پھر شرم کس بات کی، ایک آرٹسٹ نے قریب آکر کہا، پھینک دو یہ کپڑے، یہ بوسیدہ کپڑے، غلاظت اور گندگی سے اٹے ہوئے، غریبوں کے خون سے لتھڑے ہوئے۔ اور وہ مسکرایا اور اُس نے گارگی کی طرف دیکھا، یہ ریشمی کپڑے، یہ غازہ، یہ لب[illegible]، یہ شانوں پر بکھرے ہوئے بال، یہ سب نئی تہذیب کی زنجیریں ہیں،

اتار دو، پھینک دو، آدمی ننگا ہے، بالکل ننگا ہے، وہ ایک وحشی ہے، اور وہ اور قریب آگیا، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب یہ دنیا والوں کے فریب ہیں، یہ حکومت کرنے والوں کی چالیں ہیں، امیروں کی سیاست اور غریبوں کی لوٹ ہے۔ اور وہ اور قریب آگیا، بیماری ... رہی تھی۔ پوڈر اتر رہا تھا، ہم انسان ہیں، ہم سب انسان ہیں۔ اور وہ قریب آگیا، اُس کا سانس گارگی کے گالوں سے مس ہو رہا تھا، اب تم غلام نہیں ہو، اب تم آزاد ہو، ہم نہ پرانی تہذیب چاہتے ہیں۔ نہ نئی تہذیب۔ ہم انسانیت چاہتے ہیں، اور وہ گارگی کے قریب بیٹھ گیا، ہم سب انسان ہیں۔ یہاں نہ کوئی امیر ہے، نہ غریب۔ ان ننگے انسانوں کو دیکھو، ان سب میں کیا فرق ہے، پھر ان کپڑوں کا کیا فائدہ، ان کپڑوں کو اتار دو، یہ ننگا آرٹ ہے، یہ ننگی تہذیب ہے، اُس نے گارگی کے اور قریب آتے ہوئے کہا، ڈر ——— شرم، جھجھک، یہ پرانی اور نئی تہذیب کی زنجیریں ہیں۔ پرانی اور نئی زنجیروں کو توڑ دو، ہوا گرم سانسوں سے بوجھل ہو رہی تھی، روشنی آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی، سناٹا، موت ——— تاریکی ——— اور ننگی کلب۔

یورپ کی سیر گارگی کو مہنگی نہ پڑی تھی، روپیہ بافراط ملتا تھا۔ جس سمت اُس کا ذہن جاتا وہ بغیر کسی تردد کے اسی سمت چلی جاتی، یورپ میں رہ کر اُس کی اخلاقی قدریں کمزور پڑ گئی تھیں، یا یوں کہیے کہ اخلاقی قدروں کا نشان ہی ذہن سے اٹھ گیا تھا، اب گارگی کا واپس ہندوستان جانے کو جی نہیں چاہتا تھا، اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے لیے حالات سازگار نہ ہوں گے۔ اگر اُس نے اس ماحول سے بغاوت کرنے کی کوشش کی، تو کہاں تک کامیاب ہو سکے گی، اب یہاں کیا کرے رہ کر۔ شباب کا اوّلین باب پیرس کی ننگی کلب میں ختم ہو گیا، اور اگر وہ یوں ہی کسی کے ساتھ چپک جانے کی کوشش کرے تو کچھ عرصے کے بعد گھر سے روپیہ آنا بند ہو جائے گا اور شباب کا بچا کھچا سرمایہ ان لوگوں کے نذر ہو جائے گا، پھر وہ کیا کرے گی۔ گارگی نے سوچ بچار کر تہیہ کر لیا، کہ اُسے واپس گھر جانا چاہیے، اُس نے ایک صبح واپس جانے کی تیاری کر لی اور ایک حسرت بھری نظر یورپ کے اوجھل ہوتے ہوئے ساحل پر ڈالی، چند دنوں کے بعد گارگی گھر آگئی، والدین کی نگاہوں میں گارگی ابھی بچہ ہی تھی، اور والدین کو اس بات کا خواب خیال

ہی نہ تھا، کہ ان کی چہیتی لڑکی زندگی کا بہترین سرمایہ یورپ کی نذر کر چکی ہے، لیکن ان کی لڑکی کی صحت پہلے سے بہتر تھی، گارگی پہلے کی بہ نسبت فربہ اندام ہو گئی تھی، گو وہ اتنی شوخ اور چنچل نہ رہی تھی اور نہ ہی وہ اب Dad کی گود میں کھیل سکتی تھی، اب وہ ایک عورت تھی، گارگی کو اب بھی خوشنما کپڑوں کے پہننے کا شوق تھا، وہ بھڑکیلے چمکیلے لباس بہت پسند کرتی تھی چہرے کی خوب صورتی برقرار رکھنے کے لیے سو جتن کرتی، پوڈر، غازہ لپ سٹک کا بدستور استعمال کیا جاتا تھا، گارگی اب زیادہ بے باک ہو گئی تھی، اُسے اپنے دوستوں کی آرام کا بہت خیال رہتا تھا۔ ڈرائنگ روم ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا، اور رنگوں کے امتزاج کا اُسے بہت سلیقہ تھا، وہ اکثر رات کے بارہ بجے کے بعد ہی گھر آتی تھی۔ ڈنر، بال روم، سینما، کلب وغیرہ میں اس کا زیادہ وقت صرف ہوتا تھا، اور گھر میں دوستوں، عاشقوں اور مداحوں کا ایک تانتا بندھا رہتا۔

گھر والوں نے تنگ آ کر گارگی کی شادی ڈاکٹر شرما سے کر دی، ڈاکٹر شرما شہر کے مشہور ڈاکٹروں میں سے تھے۔ اُن کی پریکٹس خوب چلتی تھی، لاکھوں کے مالک تھے۔ انھوں نے بھی

یورپ کی خوب سیر کی تھی، گو ڈاکٹر شرما خوب صورت نہ تھے، لیکن انھیں بدصورت بھی نہیں کہا جاسکتا، روپے کی فراوانی انسان کی بہت سی کمزوریاں چھپا دیتی ہے، پہلے تو گارگی نے حیل وحجت کی، لیکن پھر ڈاکٹر شرما سے شادی کرلی، شادی کے بعد گارگی نے محسوس کیا، کہ وہ اپنے خاوند پر اچھی طرح رعب گانٹھ سکتی ہے۔ شروع شروع میں ڈاکٹر شرما نے گارگی کو ایک دو بار ٹوکا، پھر گھر میں لڑائی جھگڑے بھی ہوئے، لیکن سب بے سود۔ اور یکایک ڈاکٹر شرما نے گارگی کو سمجھانا چھوڑ دیا، وہ وقت پر گھر آتا، کھانا کھاتا اور پھر چلا جاتا، گارگی کو روپے کی قلت نہ تھی، وہ جو کچھ چاہتی اپنے خاوند سے مانگ لیتی تھی، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ وہ ڈاکٹر شرما کی بیوی ہے۔ اور اُسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خاوند کی کمائی میں سے اپنا حصہ، جس طرح بھی چاہے، خرچ کرے، شروع شروع میں گارگی نے اپنے شوہر کو اپنے ساتھ بال روم میں لے جانے کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش کارگر ثابت نہ ہوئی، ایک دو بار دونوں رسٹوران میں اکٹھے گئے، اور گارگی نے اُسے کاک ٹیل پینے کے لیے کہا، لیکن شرما صاحب نے پینے سے انکار کردیا۔

اکثر گارگی اپنے شوہر سے پوچھتی۔

"آپ شراب کیوں نہیں پیتے۔"
"مجھے کچھ لطف نہیں آتا۔"
"کیا آپ نے کبھی شراب پی ہی نہیں۔"
"کیوں نہیں۔"
"اوہ۔"
"کتنی بار۔"
"مجھے کچھ یاد نہیں۔"
"کیا آپ اب شراب پینا گناہ سمجھتے ہیں۔"
"بالکل نہیں۔"
گارگی یہ سن کر چپ ہوجاتی، اور دل ہی دل میں کڑھتی۔ اور پھر سوال کرتی۔
"آپ میرے ساتھ ڈانس نہیں کرتے۔"
"میں ڈانس کرنا جانتا ہی نہیں۔"
"کیا آپ نے لندن میں کبھی کسی لڑکی کے ساتھ ڈانس نہیں کیا۔" پھر زیر لب مسکراتی۔
"مجھے یاد نہیں۔"
"کیا آپ کو ناچ سے نفرت ہے۔

"بالکل نہیں"۔
"تو آپ ڈانس سیکھ کیوں نہیں لیتے"۔
"اس سے کیا فائدہ ہوگا"۔
"آپ بہت ضدی ہیں"۔

اور پھر دونوں رسٹوران سے باہر نکل کر گھر کی جانب رُخ کرتے۔

اور اس طرح گارگی اور شرما ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے، شروع میں گارگی کو کچھ بُرا محسوس ہوا۔ لیکن مداحوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اُسے اپنے خاوند کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

امجد، رمیش، پرکاش اور شیام اُس کی شاموں کو رنگین بنا دیتے، یہ لوگ بھی سوسائٹی کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جہاں روپیہ با فراط ہوتا ہے، ماں باپ لاکھوں کے مالک ہوتے ہیں، اور سوائے اس کے کہ یہ لوگ روپے صرف کرنے کے مختلف ذرائع تلاش کریں، ان کا کوئی اور مشغلہ نہ تھا، برج فلیش ریس، سوسائٹی گرلز، اینگلو انڈین یا پارسی لڑکیوں سے ملنا اُن سے باتیں کرنا، اُن سے فلرٹ کرنا، اور خوب جی بھر کر شراب

اور بہروپنا ہی ان کا کام تھا، جب کبھی کلب میں کوئی نیا چہرہ آتا تو یہ لوگ جلد ہی اس سے واقفیت پیدا کرتے، اس کے گھر آنا جانا شروع کر دیتے، اسے اپنے گھر بلاتے، کبھی چائے پر کبھی کھانے پر، شام کو سینما لے جاتے، رات کلب میں گزرتی، اور اس طرح نئی لڑکی ان سے بے تکلف ہو جاتی، اور جب گارگی کلب کی ممبر بنی تو ان لوگوں نے گارگی پر ڈورے ڈالنے شروع کیے، گارگی پہلے ہی ان باتوں میں ہوشیار تھی، وہ خود ایک تجربہ کار فلرٹ تھی اور اس فن کی ماہر تھی۔ اس کی گھریلو زندگی اتنی خوشگوار نہ تھی اور اگر گھریلو زندگی خوشگوار بھی ہوتی۔ تب بھی وہ ان باتوں سے کب باز آتی، اسے ان باتوں کا چسکا لگ چکا تھا۔ وہ زندگی کی رنگینیوں سے واقف ہو چکی تھی، اس لیے اسے اس ماحول سے مانوس ہونے میں کوئی خاص دقت محسوس نہ ہوئی۔ امجد، رومیش، پرکاش اور شیام سب لوگوں نے باری باری گارگی کو اپنانا چاہا۔ یہ یار لوگ آپس میں اتنے بے تکلف تھے، کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی باتیں بتا دیتے تھے، اکثر وہ اکٹھے بیٹھتے، اور گارگی کے متعلق گفتگو کرتے۔

"بھئی بڑی چالاک عورت ہے۔"

" کتنی ذہین ہے گارگی ۔ کیوں امجد "
" ذہانت پر خاک ڈالو، حسین کتنی ہے بیٹا، اُسے
دیکھ کر دل اپنی جگہ پر نہیں رہتا "
" دو سال پیرس میں رہی ہے ' میرے دوست "
" باتوں میں کتنا رس ہے "
" دیکھ لو کسی کو بات نہیں کرنے دیتی ' محفل پر
چھا جاتی ہے " شیام کہتا ۔
" لیکن فراخ دل بھی تو ہے " امجد کہتا اور پھر
اس کی آنکھیں مسکراتیں ۔
" اگر فراخ دل نہ ہوتی تو ہمارا کیا بگاڑ لیتی "
" ایسی عورتوں کی کلب میں اشد ضرورت ہے
میری جان " یہ کہہ کر رومیش قہقہہ لگاتا ' اور پھر لبوں پر زبان پھیرتا
اور پھر یہ لوگ گارگی کے جسم کے ہر عضو کو پرکھنے
لگتے ۔ کہ فلاں حصہ ایسا ہے ' اور فلاں حصہ ویسا ہے ' ان لوگوں
کے دلوں میں گارگی کے لیے عزت نہ تھی ' یہ لوگ زندگی کے
اس راستے پر چل رہے تھے ' جس پہ گارگی کئی برسوں سے گامزن
تھی ' یہ لوگ اُن بھنوروں میں سے تھے ' جو ہر نئے پھول کے گرد

منڈلاتے رہتے ہیں، اور جب اُس کا رس چوس لیتے ہیں تو دوسرے پھولوں کی طرف رخ کرتے ہیں، گارگی شباب کے نشے میں اُن دوستوں سے کھیلتی رہی۔ روپے کی کمی نہ تھی۔ خاوند ایسا ملا تھا، جو کبھی کچھ نہ کہتا۔ اور پھر خدا نے حسن دیا تھا، تو کیوں نہ ان باتوں کا پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے، اکثر ان لوگوں کے اظہارِ محبت کا ایک ہی طریقہ ہوتا تھا، یہی کہ پہلے کلب میں ملاقات ہوئی پھر چائے پر گھر بلایا۔ پھر کھانے پر مدعو کیا، سینما چلے گئے۔ اور جب فلم دیکھ کر واپس آئے تو چپکے سے کمر میں ہاتھ ڈال دیا اگر عورت خاموش رہتی ہے تو بات ٹھیک ہے، گارگی کے کان ایک ہی قسم کی باتوں سے مانوس ہو چکے تھے.........
یو۔ آر۔ ونڈرفل، ڈارلنگ ——— یو۔ آر۔ سویٹ۔ تم میرے خوابوں کی ملکہ ہو، ایک جام اور.........

زندگی میں وہ دن بھی آتے ہیں، جب شباب کا سونا پگھلنے لگتا ہے، بے چاری عورت کا شباب تو اتنا دیرپا نہیں ہوتا۔ اور ان کلبوں میں سوسائٹی گرلز کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے، کیونکہ یہاں ایک شمع کے گرد بہت سے پروانے ہوتے

ہیں، اور جب کبھی کلب میں کوئی نئی شمع آتی ہے، تو پروانے پرانی شمع کو چھوڑ کر نئی شمع کے گرد طواف کرنے لگتے ہیں ـــــ گارگی اب محسوس کر رہی تھی، جب سے ریکھا نے کلب میں آنا شروع کیا تھا۔ پروانے اُسے چھوڑ رہے تھے، گو امجد، رومیش، پرکاش اس کے پاس آتے تھے، لیکن کبھی کبھی زندگی میں وہ لطافت نہ رہی تھی، وہ جوش و خروش، وہ ذہنی عیش، وہ قہقہے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی جگہ کچھ کچھ گھٹی گھٹی مسکراہٹیں۔ کچھ کچے پکے وعدے، کچھ تیز اور چبھنے والی باتیں، اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے، وہ پیار اور اُنس غائب۔ زندگی بے لطف اور بے جان سی ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ گارگی کو نیم شعوری طور پر اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ریکھا کے آنے سے کلب میں اُس کی وقعت کم ہو گئی ہے، لیکن پھر بھی وہ شکست ماننے کو تیار نہ تھی، وہ بچی کھچی زندگی سے زیادہ سے زیادہ مسرت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ریکھا ایک نئی نویلی لڑکی ہے، اُس نے زندگی میں ابھی تک دیکھا ہی کیا ہے، وہ لگاوٹ کی گھاتیں نہیں جانتی۔ لیکن ریکھا کے تو خیز شباب کے آگے گارگی کی جوانی ماند پڑ چکی تھی، پروانے ریکھا کی طرف مائل پرواز تھے اور وہ پروانوں کو اپنے قبضہ میں رکھنا

چاہتی تھی، اس لیے اُس نے اپنی زندگی سے کھیلنا شروع کیا پہلے
اس کھیل میں مزہ آتا تھا، ایک قسم کی تسکین، ایک قسم کا سکون
اور جب پروانے اُس کے گرد طواف کرتے تھے، تو وہ اُسے اپنی
شخصی فتح تسلیم کرتی تھی، لیکن اب اس فتح میں تلخی تھی، اب
گارگی ہر شخص سے بے تکلف ہوجاتی، اُس کی جائز یا ناجائز بات
مان جاتی، ہر شخص سے مل کر شراب پی لیتی۔ پاؤڈر اور غازہ کا
زیادہ استعمال کرنا شروع کیا، آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے لباس
سے اپنے آپ کو آراستہ کرتی۔ لیکن اس کے شباب میں اب شوخی
نہ تھی، حسن میں وہ کشش نہ تھی، خون میں وہ حدت نہ تھی، اب گارگی
کچھ کرتی، تو محض اپنی کھوئی ہوئی وقعت کو برقرار رکھنے کے لیے، اُس
نشے میں سرشار رہنے کے لیے، جس کے لیے اُس نے اپنی زندگی کی
بازی لگا دی تھی، شاید گارگی کو اس بات کا پورے طور پر احساس
نہ تھا، کہ وہ موسمِ بہار کی گود سے نکل کر خزاں کے پہلو میں جا بیٹھی
ہے، گو اُس صبح اُسے ایک شدید دھچکا لگا، جب اُس نے دائیں
کان کے ذرا اوپر ایک سفید بال دیکھا، وہ دیر تک اِس سفید
بال کو دیکھتی رہی، اب تو آنکھوں کے نیچے کچھ جھریاں سی پیدا
ہو رہی تھیں، چہرہ بھی کمزور ذرا سا ہو گیا تھا۔ کولھوں پر زیادہ گوشت

آ گیا تھا۔ اور جسم کے خطوط میں وہ دل کشی اور جاذبیت نہیں رہی
تھی، رومیش، پرکاش اور آمجداب ریکھا کے گرد چکر لگا رہے تھے،
دراصل گارگی کو ان لوگوں سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، وہ بھی ایک
حسین تیتری کی طرح اُن سے کھیلتی تھی لیکن شیام کو چاہتی تھی، وہ
اپنا رشتہ توڑنا نہیں چاہتی تھی، شیام کے خدوخال میں ایک عجیب
قسم کی دل فریبی تھی۔ اُس کی باتوں میں لطافت تھی، روانی تھی،
ان گنت باتیں، وہ اکثر اُسے تمنا اور بے ہودہ بھی کہہ دیتا تھا،
لیکن وہ ان گالیوں کو نظر انداز کر دیتی تھی، اور جب کبھی وہ شراب پی
لیتا، تو وہ اُس کی گود میں سر رکھ دیتا اور نہایت بے تکی باتیں کرتا اور
پھر کہتا۔ یو تمنا یو .... پھر اُس کے ہاتھوں کو چومتا، اُس
کے بالوں سے کھیلتا، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتا
اور اُس کی حنائی انگلیوں کی تعریف کرتا، وہ شیام کے ریشمی بالوں
میں انگلیاں پھیرنے لگتی حتیٰ کہ شیام کو نیند آجاتی اور وہ وہیں صوفے
پر سو جاتا۔

شیام کم عمر تھا، اور کلب میں نیا نیا آیا تھا۔ اُس کا
مردانہ حسن دیکھ کر لڑکیاں اس کی طرف مائل ہوتیں، لیکن گارگی نے
اُسے ابھی تک اپنے جال میں پھانس رکھا تھا، کبھی کبھی گارگی سوچتی

کہ وہ شیام سے شادی کرلے، آخر کلب میں کئی لڑکیوں نے اپنے پہلے خاوندوں کو طلاق دے کر شادیاں کرلی تھیں، اُسے بھی اپنے شوہر سے نفرت تھی، وہ سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر اُسے کبھی پیار نہیں کرسکتا، اور وہ زندگی کے آخری دنوں میں تنہا نہیں رہنا چاہتی تھی، کیا شیام اُس سے شادی کرے گا، وہ اس بات پر غور کرنے لگی، اور پھر اُسے خیال آیا کہ وہ شیام سے کیوں شادی کرے، آخر اس شادی کا مطلب ہی کیا، دراصل وہ کسی کا سہارا چاہتی تھی، اُس نے تہیّہ کرلیا کہ وہ آج شیام سے شادی کے متعلق گفتگو کرے گی، اب وہ زیادہ عرصہ انتظار نہیں کرسکتی، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اگر اُس نے زیادہ عرصہ انتظار کیا تو شیام بھی اُس کے چنگل سے نکل کر ریکھا کا گرویدہ ہوجائے گا!

لیکن ایسا کیوں ہو، وہ شیام سے شادی نہیں کرے گی، بلکہ اُس سے یہ کہے گی، کہ وہ آج سے کسی دوسری عورت سے تعلق نہ رکھے، وہ صرف اُس سے محبت کرے اور وہ زندگی بھر اُس سے محبت کرتی رہے گی شادی تو اُس کی ہو چکی تھی اب دوبارہ شادی کرنے سے کیا فائدہ، اور جب دن ڈھلے شیام اُس کے پاس آیا، تو گارگی نے خوب اُس کی آؤ بھگت کی، وہی پیار محبت کی باتیں۔ آج شیام چپ چپ تھا، اُس کی باتوں میں نہ وہ لطافت تھی نہ وہ شگفتگی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد

شیام اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جانے کے لیے اجازت مانگی نگار گی حیران رہ گئی۔

"تم بیٹھتے کیوں نہیں شیام" آواز میں بے حد نرمی تھی۔

"کچھ بات نہیں ممتی نگارگی"

"کہاں جا رہے ہو"

"ریکھا نے بلایا ہے۔ رومیش، امجد اور پرکاش وہیں ہوں گے"

"شیام!" نگارگی نے حریصانہ نظروں سے شیام کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے" شیام نے نکٹائی کی گرہ کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں"

"بہت پرانی بات ہے نگارگی"

"کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے"

"بہت جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں" وہ کوٹ کے کالر پر سے گرد جھاڑنے لگا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تم ہی نے تو سکھایا ہے، اچھا میں جاتا ہوں گڈ بائی"

"شیام" گارگی نے چیخ کر کہا، میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

شیام کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی نے گارگی کو بے دست و پا کر دیا، اُس نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں، اور شیام سے کہنے لگی۔ نکل جاؤ، کمینے کہیں کے، اور شیام نے ایک اور قہقہہ لگایا، اور سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا، گارگی چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی، بالکل اس قمار باز کی طرح جو اپنا تمام مال و متاع لٹا چکا ہو، وہ رونا چاہتی تھی، لیکن رو نہ سکی، اس کے کانوں میں مدھم لہجے میں چند الفاظ ٹکرا رہے تھے، ——— ڈارلنگ ——— ایک پیگ اور ——— بس ایک چھوٹا سا ننھا سا پیگ........ اب یہ الفاظ کون کہے گا، وہ سوچنے لگی، لیکن بدستور یہ الفاظ اُس کے ذہن میں گشت لگا رہے تھے، کیا وہ ان لفظوں کو کبھی نہ بھول سکے گی، کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے، وہ دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی، سامنے باغیچے میں اُس کا شوہر بیٹھا ہوا تھا ایک سیکنڈ کے لیے وہ جھجکی، لیکن دوسرے لمحے میں وہ اپنے خاوند کے سامنے کھڑی تھی۔

"میں جانتا تھا کہ تم ایک دن میرے پاس آؤ گی۔"

"مجھے معاف کردو۔"

"معافی کی کوئی بات نہیں گارگی۔"

"کیا آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔"

"محبت سے ابھی تک جی نہیں سیر ہوا تمہارا۔" آواز میں رعب اور خود اعتمادی تھی۔

"اب مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا۔" آواز میں احساس شکست........

"میں جانتا ہوں۔"

"میں کہاں جا سکتی ہوں۔"

"تم کہاں جانا چاہتی ہو۔"

"آپ تو شاید مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔"

"شاید۔ آخر میں بھی انسان ہوں، دیوتا تو نہیں۔ مجھے ان باتوں کا بہت رنج ہے، میرے پاس بہت مریض آتے ہیں، میں ان کا علاج کرتا ہوں، مجھے تمہاری بیماری کا علم تھا۔ لیکن میں علاج کرنے سے قاصر تھا، اور اگر آج تم نے اس بیماری سے چھٹکارا حاصل کر لیا، تو یہ بھی میری فتح ہے۔"

اور گارگی بچوں کی طرح رونے لگی ۔ اس نے اپنا سر شوہر کے زانوں پر رکھ دیا، شرما نے آہستہ آہستہ اپنی انگلیاں گارگی کے بالوں میں پھیرنی شروع کیں، اور یکایک مسز شرما کو محسوس ہوا کہ ان ہاتھوں کا لمس باقی ہاتھوں سے کتنا مختلف ہے، اس لمس میں کتنا خلوص ہے، کتنا پیار ہے، ایک قسم کی پدرانہ شفقت، جس کے احساس سے وہ آج تک محروم تھی ۔ اس لمس میں ایک قسم کی کیفیت ہے، جو حیوانیت سے گریز کرتی ہے، آج تک وہ اس لمس سے بیگانہ تھی ۔



برف

وہ لکڑی کی کرسی پر اپنی پتلی دُبلی ٹانگوں کو اکٹھا
کرکے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی رانیں، پیٹ سے ہم کنار ہوتی ہوئی
اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں، اُس نے اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں
پر رکھتے ہوئے باہر نظر دوڑائی، آسمان بادلوں سے گھرا ہوا
تھا۔ اور ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی، کبھی کبھی ہوا کا تیز جھونکا
آتا۔ تو وہ سردی سے مغلوب ہوکر، اپنے دائیں ہاتھ کو رانوں
میں دباتے ہوئے پنج تارے کے درخت کی طرف دیکھنے لگتا
پنج تارے کا درخت پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ سُرخ سُرخ پھول
اُس کی آنکھوں کے سامنے تیرتے ہوئے نظر آئے، اس ہلکی ہلکی
بارش میں پنج تارے کے پھول محبوب کے لبوں کی طرح نظر آتے

تھے، سرخ، تر و تازہ نازک بوسوں کی نمی میں بھیگے ہوئے۔ کبھی کوئی پرندہ درخت کی نازک ٹہنی پر آتا اور اپنے نرم و نازک پروں کو ہلاتا ہوا، اکڑوں ہوکر بیٹھ جاتا۔ ہوا سرد تھی، ٹھنڈی اور یخ بستہ، جسم کے ہر مسام میں سرایت کر رہی تھی، وہ اُس اذیت ناک سردی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا، اس لیے وہ کرسی پر ٹانگوں کو اکٹھا کرکے اور اکڑوں ہوکر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کا دایاں ہاتھ رانوں میں دبا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے سے یاسیت اور بے بسی ٹپکتی تھی، اُس کی کرسی برآمدے میں تھی، اور برآمدے کے ایک کونے میں چولھا تھا، جس میں سے بے حس، بے جان سا دھواں اٹھ رہا تھا، وہ دیر تک اس سیاہ دھوئیں کی طرف دیکھتا رہا۔ دھواں برآمدے میں ہی چکّر لگا رہا تھا، جیسے باہر کھلی فضا میں جانے سے ڈرتا ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا یخ بستہ جھونکا ذرا تیزی سے آتا تو اس کی ناک اور کان سردی سے نیلے ہو جاتے۔ اور وہ اپنے جسم کو سکیڑتا، اپنے پیٹ کو ٹانگوں سے بھینچتا۔ اور ——— ہاتھ کو گرم گرم رانوں میں دباتا ہوا سُرخ سُرخ پھولوں کی طرف دیکھنے لگتا، کبھی کبھی اس کی نگاہیں ان پھولوں سے ہٹ کر سامنے کی کھڑکی کی طرف جاتیں، اُسے

اس کھڑکی کی جانب دیکھنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ جب وہ پہلی بار اس گھر میں وارد ہوا تھا، تو اسی برآمدے میں بیٹھ کر اس نے سرخ ہونٹوں والی لڑکی کو دیکھا تھا۔ اُن دنوں وہ اکیلا نہ تھا، بلکہ اس کی والدہ اس کے ساتھ رہتی تھی، اس کی والدہ کو یہ پسند نہ تھا۔ کہ وہ کبھی شہر کی جوان لڑکیوں کی طرف دیکھے، اور جب کبھی جوان لڑکیاں گھر میں آتیں۔ تو اس کی ماں اسے گھر سے باہر چلے جانے کو کہتی، یا وہ خود ہی دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ اس کی ماں یہ کبھی برداشت نہ کرسکتی تھی۔ کہ اس کا لڑکا کسی نوجوان لڑکی سے گفتگو کرسکے، اور لڑکیاں بھی اس کی ماں سے بہت خوف زدہ تھیں، اور جب کبھی وہ اس کی ماں سے ملنے آتیں، تو کانپتی، ڈرتی، سہمی ہوئی گھر میں داخل ہوتیں، اکثر وہ سر ڈھانپ کر آتیں، اور ان کی نگاہیں زمین کی طرف لگی رہتی تھیں۔

اس نے آج تک کسی لڑکی کو قہقہہ لگاتے ہوئے نہ سنا تھا، لڑکیاں ہمیشہ سرگوشیانہ انداز میں باتیں کرتیں، وہ دل ہی دل میں اپنی ماں کو کوستا رہتا تھا۔ آخر اس کڑی نگرانی کا کیا مطلب تھا؟ لیکن وہ اپنی ماں کے خلاف کچھ نہ کہہ سکتا تھا، اور وہ کہتا بھی کیونکر۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہی اٹھارہ سال، جب وہ

کالج میں نیا داخل ہوا تھا، تو زندگی کے متعلق اس کی معلومات نہایت محدود تھیں، شاید اس کی ماں اس کے بھلے کے لیے کہتی ہو، اور یہ روک تھام، یہ کڑی نگرانی، یہ بندشیں اس کے لیے مفید ثابت ہوں، لیکن وہ اس عمر میں کچھ اور ہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک نئی لذت سے آشنا ہو رہا تھا، وہ اپنے آپ کو کھلی فضا میں چھوڑنا چاہتا تھا، تاکہ وہ ایک پرندے کی طرح اس فضا میں اڑتا رہے۔ حتیٰ کہ اس کے پر اس اڑان سے تھک جائیں، اور وہ اس تھکن سے چور ہو کر اس مخملیں گھاس پر لیٹ جائے، اور سوچتا رہے، کس کے متعلق؟ یہی تو وہ سوچنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک نئی لذت، ایک نئی مسرت، ایک نئی قوت سے دوچار ہو رہا تھا، اور جب کبھی وہ کسی جوان لڑکی کی طرف دیکھتا، تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، پھر وہ لڑکی کو دیکھ کر شرما جاتا، جیسے وہ کسی فاش غلطی کا مرتکب ہوا ہے، اور اگر لڑکی بھی اس کی طرف دیکھ لیتی، تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگتا، اور تمام رات لڑکی کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا، اکثر وہ لڑکی سے دوبارہ ملنے کی تمنا کرتا، اور جب کبھی شہر کی گلیوں میں لڑکی اسے ملتی تو وہ اس کی طرف دیکھتا ہی رہتا مگر

اس سے کچھ نہ کہہ سکتا، اور جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوجاتی، تو وہ اپنے آپ کو کوسنے لگتا۔ کہ وہ کیوں نہ اُس سے بات کرسکا۔ اکثر اسے اس بات کا خدشہ لگا رہتا تھا، کہ اگر اس نے کسی لڑکی کو چھیڑ دیا۔ اور لڑکی نے اس کی ماں سے شکایت کردی، تو وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ اسی وجہ سے وہ گھٹا گھٹا سا رہتا، اور اسے ایسا محسوس ہوتا، کہ اس کے جسم کے اندر ایک طوفان بند ہے، جو رہائی کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔

اور اب وہ اپنی ماں سے ۵۰۰ میل دور تھا، اس کی حرکات و سکنات اور اس کی باتوں میں خود اعتمادی آگئی تھی، وہ اب لڑکیوں کو بے باک نگاہوں سے دیکھتا تھا، اور کبھی کبھی انھیں اشارے بھی کیا کرتا، اس لڑکی کے ہونٹ کتنے سرخ تھے، جو اکثر کھڑکی کے قریب کھڑی ہوا کرتی تھی ــــ وہ صبح کے وقت وہیں بال سنوارا کرتی۔ مشرق سے سورج کی نئی، تازہ کرنیں اس کے بالوں کو چومتیں، اور وہ ان لمبے لمبے تاروں کو حیرت سے دیکھا کرتا۔

کاش وہ ان بالوں کو چھو سکتا۔ اور ان کی ملائمت سے لطف اندوز ہوسکتا۔ لڑکی کے بال کتنے سیاہ تھے، جیسے

سردیوں کی راتوں کی تمام سیاہی اس کے بالوں میں جذب ہوگئی ہو، لیکن سب سے جاذب نظر چیز لڑکی کے سرخ ہونٹ تھے، وہ اکثر لڑکی کو برآمدے میں آنے کے لیے کہتا، اور لڑکی اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی، اس کی مسکراہٹ میں کتنی رونق تھی، صبح کی دھوپ میں لڑکی کے ہونٹ اور چمکنے لگتے، لبوں پر اور سرخی آجاتی، اور وہ اپنے سیاہ، ریشمی بالوں میں نہایت تیزی سے کنگھی کرنے لگتی، کبھی کبھی وہ دھیمی آواز میں گنگنانے لگتی، آواز دھیمی ہوتی تھی، نہایت ہی مدھم اور شیریں، اس لیے وہ لفظوں کا مفہوم نہ سمجھ سکتا تھا، کیا یہ ضروری تھا، کہ وہ لفظوں کے مفہوم کو سمجھ سکے، کیا آواز کی موسیقی چھپی ہوئی لڑکی کچھ کی کچھ دبی ہوئی خواہشوں کو بے نقاب نہ کر رہی تھی، ــــــــ پھر وہ برآمدے میں ٹہلنے لگتا۔

چولھے کا دھواں آہستہ آہستہ برآمدے میں پھیل رہا تھا، کالا، سیاہ دھواں۔ اس دھوئیں نے تو چھت کو سیاہ کر دیا تھا، اور دیواریں بھی آہستہ آہستہ سیاہ ہو رہی تھیں، کیا اس کا دل بھی ایک دن سیاہ ہو جائے گا۔ اور روشنی کی کرن ہمیشہ کے لیے مفقود ہو جائے گی، ایک دن

لڑکی کی ماں نے یہ تمام ماجرا دیکھ لیا۔ اسی وقت وہ لڑکی کو بالوں سے گھسیٹتی ہوئی نیچے لے گئی، اس کے بعد اس نے لڑکی کو کبھی تنہا نہ دیکھا، جب کبھی وہ قریب آتی۔ تو اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ہوتا، چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ لڑکی کو ہسٹیریا ہوگیا ہے۔ وہ رات بھر چلاتی رہتی، لڑکی کی چیخیں اسے سونے نہ دیتی تھیں، اور جب وہ بستر پر لیٹ جاتا تو لڑکی کے سُرخ ہونٹ اس کی آنکھوں کے سامنے طواف کرتے اور وہ دیر تک جاگتا رہتا، اور پھر اسے معلوم ہوا۔ کہ لڑکی پاگل ہوگئی ہے، اور اب وہ برآمدے میں بیٹھ کر جب لڑکی کو کھڑکی میں کھڑا دیکھتا، تو اس کے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ جاتی لڑکی کے چہرے پر ایک عجیب تبسم کی مایوسی تھی، نہ وہ مسکراہٹ تھی، نہ وہ آنکھوں کی چمک۔ اب لب بھی سرخ نہ تھے، وہ پیلے اور زرد ہوگئے تھے، وہ حیرت زدہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتی اور ہاتھ سے اشارے کرتی، ان اشاروں کا کیا مطلب تھا، اب بھی وہ باتیں کرتی، کبھی کبھی یونہی ہنستی، اور پھر بالوں کو نوچنے لگتی، اور جب بال نوچتے نوچتے تھک جاتی، تو دھیمی آواز میں گنگنانے لگتی، لیکن وہ شعریت کہاں گئی، وہ موسیقی کیوں

مٹ گئی، زندگی کا سرچشمہ کیوں خشک ہوگیا؟ ہینج تارے کے پھول ابھی تک سرخ تھے، آسمان بادلوں سے اسی طرح گھرا ہوا تھا، سورج کی کرنیں اب بھی سرسبز پتوں سے آنکھ مچولی کرتی تھیں، قدرت کا حسن اُسی طرح قائم بالذات تھا۔ لیکن لڑکی کا حسن فنا ہو چکا تھا۔

اس روح فرسا حادثے کے بعد اس نے ساتھ والے گھر کی طرف نگاہ کی تھی، ساتھ والے گھر اور اس کے درمیان صرف ایک دیوار تھی، دیوار کوئی خاص اونچی نہ تھی، وہ اس دیوار کو بڑی آسانی سے پھاند سکتا تھا۔ لیکن پھاندنے کے لیے اتنی ہمت نہ تھی، دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا، جس میں سے وہ ایک لڑکی کو دیکھا کرتا تھا، اکثر جب صحن میں دھوپ آجاتی، سردیوں کی دھوپ بھی کتنی میٹھی اور پیاری ہوتی تھی، وہ کپڑے اتار کر اور ایک لنگوٹا پہن کر صحن میں آجاتا، اور اپنے جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کرنے لگتا، کبھی کبھی لڑکی بھی اُسی سوراخ سے اسے دیکھنے لگتی۔ صرف وہ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ سکتا تھا، اُن آنکھوں کی ہر حرکت سے آشنا ہو چکا تھا، پلکوں کی ہلکی سی جنبش، ابروؤں کے کھنچاؤ سے وہ لڑکی کے جذبات کو پڑھ سکتا تھا، کبھی کبھی وہ

ایڑیوں پر کھڑی ہوکر اسے دیکھتی، تو وہ اس کے رخساروں اور لبوں کو دیکھ لیتا، صرف ایک ثانئے کے لیے، صرف ایک لمحے کے لیے، ــــــــ لڑکی کے لب حرکت کرتے، اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے بادلوں میں بجلی کوندی ہے، لڑکی کے لبوں کی جنبش، اس کی آنکھوں کی بے پناہ تڑپ، اس کے رخساروں کی ہلکی سی جھلک ــــ وہ کبھی نہیں بھول سکتا، اور پھر وہ اپنے جسم پر زور زور سے تیل کی مالش کرنے لگتا، کبھی کبھی وہی لڑکی ایک چھوٹے بچے کو اٹھا کر سوراخ کے قریب آجاتی، اور بچے کو زور زور سے چومنے لگتی، وہ بوسوں کی اس نازک لطیف لذت بھری آواز کو برداشت نہ کرسکتا تھا، وہ چاہتا تھا، کہ اس دیوار کو پھاند کر دوسری طرف چلا جائے، اور لڑکی کو اپنی باہوں میں جکڑ کر اتنے زور سے چومے، کہ اس کی روح کی بھوک اور تشنگی ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔ وہ ہر روز یہی تہیہ کرتا، کہ وہ آج ضرور دیوار پھاند کر دوسری طرف چلا جائے گا۔ لیکن یہ ارادہ ہمیشہ ارادہ ہی رہا۔ وہ اس پر کبھی عمل نہ کرسکا۔ حتیٰ کہ لڑکی کے والدین کو اس بات کا علم ہوگیا، انھوں نے لڑکی کو گاؤں میں بھیج دیا، چند ماہ بعد لڑکی کی شادی ہوگئی، اس بات کو آج دو سال ہوچکے ہیں، کبھی کبھی لڑکی میکے آتی ہے، تو اس کی گود

گود میں ایک ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا بچہ ہوتا ہے، وہ اکثر لڑکی کی طرف گرسنہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ لیکن اب لڑکی کی آنکھوں میں چمک پیدا نہیں ہوتی، اس کی آنکھیں ٹھیرے ہوئے تالاب کی طرح "پرسکون ہیں۔ اس کے ہونٹوں کی لرزش غائب ہو چکی ہے، وہ چپ چاپ اس کے قریب سے گزر جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ اسے بالکل نہیں پہچانتی" اور آج کل اس کے دائیں بائیں ایک افسردگی ہے۔ ایک اداسی ہے، ایک اجنبیت ہے، جس کے احساس سے اس کے ذہن میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

اب بھی وہ کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے، لیکن کھڑکی بند ہے، اب بھی وہ سوراخ کی طرف نگاہ کرتا ہے۔ لیکن کسی کے لب اب جنبش نہیں کرتے، کسی کی آنکھیں اب نہیں مسکراتیں، کسی کی پلکیں اب اس کے دل میں ارتعاش پیدا نہیں کرتیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ زندگی جامد ہے۔ غیر متحرک ہے، اس کی ہر حرکت، ہر جنبش پر ایک اندھی طاقت، ایک اندھی قوت نے قبضہ کر لیا ہے، ناچار اس کی نگاہیں، ان سرخ سرخ پھولوں کی

طرف اٹھ جاتی ہیں، اس ذہنی کشمکش، اس جنسی جمود نے اس کے دماغ پر ایک عجیب اثر ڈالا ہے، اب اس کا ذہن زہر آلود ہو گیا ہے اب بھی وہ لڑکیوں کی طرف دیکھتا ہے، لیکن اب اس کا دل زور زور سے نہیں دھڑکتا، بلکہ اسے لڑکیوں کو چھونے کی تمنا ہوتی ہے وہ ان لڑکیوں کے جسموں کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہے، وہ یہ جاننا چاہتا ہے، کہ ان لڑکیوں میں کیا ہے، کیوں نہ ان لڑکیوں کے جسموں کو اپنے ہاتھ سے چھو کر دیکھے کیوں اُس کے ذہن پر ناقابل بیان بوجھ ہے، کیوں وہ راتیں جاگ جاگ کر کاٹتا ہے کیوں اُس کی آنکھوں کے سامنے کسی کے سرخ ہونٹ پھڑکتے رہتے ہیں، کیوں کسی کی گرسنہ آنکھیں اسے پریشان کرتی ہیں ۔ کیوں کسی کی لڑکھڑاتی اونگھتی، غیر مسلسل چیخیں، شکست خوردہ سپاہیوں کی طرح اس کے دماغ سے ٹکراتی ہیں، اور اسے قلبی اور ذہنی اذیت پہنچاتی ہیں ۔ عورت اور مرد میں اتنا تفاوت کیوں ہے، اور وہ انہی باتوں سے اپنے دماغ کو پریشان کیا کرتا ۔ اور لکڑی کی کرسی پر بیٹھ کر سرخ سرخ پھولوں کی طرف دیکھا کرتا ۔

آج آسماں پر بادل چھائے ہوئے تھے ۔ ہوا ٹھنڈی اور یخ بستہ تھی، ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، ماحول میں

ناقابلِ بیان تلخی تھی، اور اس کا نوکر چولھے میں آگ جلا رہا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کو بلایا۔ جس کا نام اس نے جرنیل رکھ دیا تھا۔

"جرنیل"

"جی حضور"

"آج بہت سردی ہے" اس نے سانس کو ہوا میں چھوڑتے ہوئے کہا، اس کی آنکھوں کے سامنے ہلکی سی دھند چھا گئی۔

"آج برف پڑے گی۔"

"جی ہاں۔"

"آج بھی تم اس کے گھر جاؤ گے؟"

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، بابو صاحب"۔ جرنیل ہنس کر بولا۔

"کیا تم اُس کے خاوند سے نہیں ڈرتے؟"

"بالکل نہیں صاحب۔"

"وہ تمھیں جان سے ماردیگا۔"

"میں اُس کے گھر ایک سال سے جارہا ہوں۔"

"کیا اس کے خاوند نے تمھیں ایک بار بھی نہیں دیکھا؟"

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، اس نے رانوں کو زور سے دباتے ہوئے کہا۔

"وہ رات کو کہاں سوتی ہے؟"

"اپنے خاوند کے کمرے میں۔"

"تم اسے کہاں ملتے ہو۔"

"اُسی کمرے میں۔"

"جھوٹ۔"

"بالکل ٹھیک ہے صاحب۔"

"کیا وہ افیون کھا کر سوتا ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں، میں صرف اپنی محبوبہ کے اشارے کا منتظر رہتا ہوں۔ جب وہ دروازہ کھولتی ہے تو میں بے دھڑک اندر چلا جاتا ہوں۔"

"تمھیں ڈر نہیں لگتا؟"

"بالکل نہیں۔"

"تم واقعی جرنیل ہو۔"

آسمان پر بادل زیادہ گھرے ہوئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ آج برف ضرور پڑے گی، وہ پہاڑوں پر سفید دھند چھائی ہوئی تھی، اور آہستہ آہستہ چوٹیوں سے پھسلتی ہوئی پہاڑوں کے دامن میں پناہ گزیں ہو رہی تھی، جرنیل کی محبوبہ نے اس کے دل دماغ میں ایک عجیب جنونی کیفیت پیدا کر دی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ صبح کا ہر ذرہ بیدار ہو چکا تھا، "یہ بیداری اچھی نہیں" اس نے سوچا۔ وہ نوکر کی طرف پُرمعنی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ کیا وہ اس سے کہہ دے۔ کہ ایک رات کے لئے وہ اپنی محبوبہ کو اس کے پاس بھیج دے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے، شاید وہ یہ بات سن کر نوکری چھوڑ دے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے، نہیں، نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا اور وہ دیر تک اس بات پر غور کرتا رہا کہ کسی کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

"جرنیل، دیکھو، کون ہے۔"

"صاحب کوئی کتا ہوگا۔"

"دیکھو تو سہی۔"

پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"اندر آجاؤ" جرنیل نے اونچی آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا ۔ ایک عورت اندر داخل ہوئی، دالان سے گزرتی ہوئی برآمدے میں آگئی اور پھر ستون کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی، اس نے عورت کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ اس کے کپڑے جا بجا سے پھٹے ہوئے تھے ۔ سر کے بال خاک آلود تھے وہ بارش سے بھیگ چکے تھے اور ان کی بہت سی لٹیں، کانوں اور رخساروں سے چپکی ہوئی تھیں ۔

"کیوں کیا بات ہے؟" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں بھوکی ہوں"

وہ اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا

چہرے کی جلد سفید تھی ۔ اسے کچھ ڈھارس ہوئی ۔

"کیا تم کام نہیں کرسکتیں، کافی ہٹی کٹی ہو اور پھر یوں ہاتھ پھیلا کر مانگ رہی ہو" اُس نے استہزا سے کہا۔

"بابو ۔ کوئی کام ہو تو بتاؤ میں کرنے کے لیے تیار ہوں" اس نے برآمدے میں بیٹھتے ہوئے کہا ۔

اب وہ اس عورت کی طرف بغور دیکھنے لگا۔

عورت کی عمر اٹھارہ یا بیس برس کی ہوگی، گندے اور پھٹے ہوئے کپڑوں نے اسے بدنما بنا دیا تھا، عورت کی آنکھیں خوبصورت

تھیں، گو اُن آنکھوں میں حزن و ملال کی جھلک نمایاں تھی، لیکن اس کی لانبی پلکیں اس حزن و ملال کو چھپائے ہوئے تھیں، عورت کے خدوخال دل کش تھے، لیکن اس کے ہونٹ پتلے اور سوکھے ہوئے تھے، چہرہ بھرا ہوا تھا لیکن ناک ستواں نہ تھی، رخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ صاف عیاں تھا۔ کہ اس عورت نے ایک عرصے سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ لیکن اب بھی رخساروں پر مٹتے ہوئے شباب کی رعنائی اور تازگی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ غربت اور بھوک نے اس لڑکی کو قبل از وقت عورت بنا دیا ہے، لیکن اس کے چہرے کی سپیدی میں بے پناہ کشش تھی وہ خاموش سی بت بن کر اس کی طرف دیکھنے لگی، اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ وہ ایک خوف ناک جنگل سے گزر کر ایک حسین سجے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا ہے۔ اب بادل سارے آسمان پر چھا گئے تھے، ہوا اتنی سرد ہو چکی تھی، کہ جسم کو چیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی تھی، صرف ٹین کی چھت پر بارش گنگنا رہی تھی، اس آواز میں موسیقیت سی تھی، جو اس کے دل کی موسیقیت سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔

"جرنیل"

"جی"

"اس عورت کو گیہوں صاف کرنے کے لئے دو"

اور وہ گیہوں صاف کرنے لگی، اس نے کرسی کو عورت کے نزدیک لاتے ہوئے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"گلاب" اس نے گیہوں میں سے کنکر نکالتے ہوئے کہا

"تمہارا خاوند کہاں ہے؟"

"وہ مزدوری کرنے پنجاب چلا گیا ہے"

"کیا وہ تمھیں روپے نہیں بھیجتا؟"

"کچھ بھی نہیں بھیجتا بابو"

گلاب یہ کہہ کر جلدی جلدی چھاج میں گیہوں پھٹکنے لگی، اس کی پلکیں جھک گئیں، اور اس کے لبوں پر اداسی کی لہر دوڑ گئی۔

"کہاں رہتی ہو گلاب؟"

"اس دھند کے پیچھے" اس نے دو پہاڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عورت کے لب پھر کانپے، اور دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر خاموش ہو گیا۔

"مزدوری کیا دوگے بابو؟" گلابو کے لبوں کے کونوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھرکنے لگی۔

"تمہیں کتنے روپوں کی ضرورت ہے؟" یہ الفاظ کہہ کر اس کا دل دھڑکنے لگا، اس سوال کے جواب پر اس کی مسرت کا انحصار تھا۔

گلابو مسکرائی۔

اس مسکراہٹ میں کیا کچھ نہ تھا۔ جیسے ساری کائنات سمٹ کر اسی تبسم میں آگئی ہے۔ اس مسکراہٹ میں اس نے اپنی بے بسی، بے چارگی، اپنی ناکام آرزوؤں، اپنی تلخ کامیوں کو چھلکتے ہوئے دیکھا۔ اسے اسے محسوس ہوا۔ کہ اسی عورت کے لب پھیکے اور سوکھے نہیں ہیں، بلکہ ان پھولوں کی طرح سرخ اور نرم و نازک ہیں، اس لڑکی کی لبوں کی طرح، جو پاگل ہو چکی ہے۔ ان آنکھوں میں وہی چمک نمایاں ہے جو اس نے ساتھ والے گھر میں لڑکی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ نے اسے بے دست و پا کر دیا۔ وہ طوفان جو برسوں سے اس کے سینے میں متلاطم تھا، آج

سرخ لاوے کی طرح اُس کے جسم سے پھوٹ نکلا۔ اس نے عورت کے سیاہ بالوں کی طرف دیکھا ان پر خاک جمی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اُن بالوں کو چھونا چاہتا تھا، اُس کی نگاہیں سیاہ بالوں سے ہوتی ہوئی، اُس کی سپید کھلی پیشانی کو چھوتی ہوئی، اس کی ناک کان، رخساروں اور لبوں کو مَس کرتی ہوئی اس کے سینے کی طرف بڑھیں، وہاں ایک میلا سا پھٹا ہوا دوپٹا پھیلا ہوا تھا، نگاہیں بڑھتی گئیں، پھیلتی گئیں، ذہن پر تاریکی چھاگئی، نرم و نازک غیر مرئی تاریکی ـــــــ پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھند کی طرح ـــــــ بجلی کی لہر آنکھوں میں تڑپنے لگی، کان سرخ ہوگئے، اور آنکھیں نہایت بیباکی سے کپکپاتی ہوئی اس کی ٹانگوں کی طرف گئیں، شلوار جابجا سے پھٹی ہوئی تھی، اور عورت کی رانیں بے نقاب ہو رہی تھیں، کتنی سفید جلد تھی، اور اس جلد پر ہلکی پتلی سی لکیریں، وہ اس جلد کو چھونا چاہتا تھا۔ یہ سفیدی کیا ہے، اس گوشت میں کیا ہے۔ اگر وہ اس گوشت کو چھوئے۔ تو وہ کیا محسوس کریگا؟ یہ سفید، سفید لکیریں کدھر جاتی ہیں وہ سر سے لے کر پاؤں تک لرز گیا۔

گلاب نے اُس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں مسکرائیں۔

"تمھیں کتنے روپوں کی ضرورت ہے؟"

"روپے" گلاب نے چونک کر کہا۔ جیسے کسی بھیانک خواب کو دیکھ کر جاگی ہو۔

"ہاں"

"آٹھ آنے"

"میں تمھیں آٹھ آنے نہیں، بلکہ ایک روپیہ، دو روپے، تین روپے، چار روپے دونگا" یہ کہہ کر وہ رک گیا۔

گلاب نے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر تم میری بات مان جاؤ" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گلاب نے نگاہیں نیچی کرلیں۔

"تم اندر آجاؤ، یہ الفاظ وہ جلدی سے کہہ گیا اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ کوئی غیبی قوت اس سے یہ الفاظ کہلوار ہی ہے۔ ایک ایسی غیبی قوت جسے وہ پہچان نہیں سکتا۔ جس کی ہر جنبش اس کے جسم میں آگ لگارہی ہے وہ ایک ایسی لذت ایسے تعیش سے ہمکنار ہورہا تھا۔ جس کی گراں باری کا وہ متحمل نہیں ہوسکتا، اس کی روح نے بچپن کے بوسیدہ کپڑوں کو اتار کر نیا قالب اختیار کرلیا تھا۔ وہ اپنی روح کی طاقت سے ایک انتہی خیز

کی تخلیق کریگا جو نہایت نرم، خوبصورت، غیر فانی اور غیر محسوس ہونے والی ہو گی۔ اس کے خون میں شعلے بھڑکنے لگے، اور اس کے رخسار آتشیں ہو گئے ——— آہستہ آہستہ تاریکی پہاڑوں پر سے پھسلنے لگی۔ چوٹیوں سے پھسلتی ہوئی جنگلوں میں سے گزرتی ہوئی، درختوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی پتوں کو چومتی ہوئی نیچے کی طرف بڑھی، یہاں اب سبزہ ہی سبزہ تھا۔ نرم، ملائم، مخملیں گھاس اگھنے جنگل اب معدوم ہو رہے تھے، پہاڑ کے دامن میں کچھ سنگلاخ چٹانیں تھیں، جن کے قریب دریا آہستہ آہستہ بہ رہا تھا، تاریکی سطح آب کو چھوتی ہوئی شہر کی طرف بڑھی، شہر کے مکانوں کو آغوش میں لیتی ہوئی، تاریک اور گندی گلیوں سے گزرتی ہوئی پنجتارے کے درخت کی طرف بڑھی اور پھر اس کے جسم کے ارد گرد چھانے لگی، اس نے محسوس کیا۔ کہ اب اور کوئی راستہ نہیں، اب مکمل اندھیرا ہو جائیگا۔ اور پنجتارے کے پھول بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ یہ اذیت ناک سردی، یہ پھیلے ہوئے بادل یکایک تاریکی میں سما جائیں گے۔ بادل خاموشی سے بھاگے جا رہے تھے اور ٹھنڈی برفیلی ہوا اُس کے ہاتھوں کو چھوتی ہوئی آگے نکلتی جا رہی تھی، اور اس کی رگوں میں ایک نئی زندگی ایک نئی لذّت کا

راگ موجزن تھا، وہ دیر تک اپنے غیر فانی ہاتھوں سے گلاب کے جسم کو ٹٹولتا رہا۔ اس کا ہاتھ اس کی چھاتیوں سے ہوتا ہوا، اس کے نرم، لچکیلے پیٹ کی طرف بڑھا، اور پھر کولھوں کو چھوتا ہوا۔ اس کی بھری رانوں سے پھسلا۔ آج اس کے دل میں ایک وحشی راگ موجزن تھا، وہ گلاب کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ گلاب کی آنکھیں بند تھیں، اس نے گلاب کے لبوں کو چوما۔ گلاب کے لب ٹھنڈے تھے، اور اندر کی طرف بھنچے ہوئے تھے۔ یکایک وہ ٹھٹک کر پرے ہو گیا۔

"گلاب"۔ اس نے تھرائی ہوئی مایوس آواز میں کہا۔

"بابو"۔ اور گلاب کی آنکھیں جھک گئیں، اور گلاب کے لب پھر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

اس وقت اسے محسوس ہوا۔ کہ گلاب کا جسم ٹھنڈا ہے، برف کی طرح بالکل سرد اور یخ بستہ۔ اس ٹھنڈے لمس نے اس کے ذہن کو بیدار کر دیا، گلاب کے برفیلے احساس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ گلاب بستر پر ننگی لیٹی ہوئی تھی جیسے وہ کہہ رہی تھی، جو کچھ کرنا ہے، کرلو، مجھے اس کام سے کوئی سروکار نہیں، کوئی واسطہ نہیں، لیکن میں انکار بھی نہیں کرتی، یہ عجیب بات ہے

کہ کسی کام سے کوئی تعلق ہی نہیں، اور یہ کیسی بات ہے۔ اسے اس کا پتہ نہیں لیکن جس بات نے اس کے ذہن کو بیدار کیا۔ وہ عورت کا سرد لمس تھا۔ کیا عورت کا جسم سرد ہوتا ہے۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو چھوا تھا لیکن کتنا تلخ تجربہ تھا۔ اس کا جسم کیوں انگاروں کی طرح جل رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا، اس ننگی عورت پر غصہ آیا، جس نے اس کے تخیل کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ بھلا اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، نہایت سیدھی سادھی بات ہے، بات کیا ہے، وہ سوچنے لگا، کچھ بھی نہیں، یہ عورت کیوں لیٹی ہوئی ہے۔ اور تم کیا سوچ رہے ہو، اس کمرے میں اندھیرا کیوں ہے یہ میلے اور بوسیدہ کپڑے کس کے ہیں، ان میں سے کیوں بدبو آرہی ہے۔ اب اسے اس اندھیرے میں کمرے کی ہر چیز نظر آنے لگی، الماریاں کھلی پڑی تھیں، ان میں صرف ادویات کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں، ایک کونے میں تین چار ٹرنک پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کونے میں گھی کا ٹین رکھا ہوا تھا، کیا یہ ہسپتال ہے، کیا یہ دوکان ہے جہاں گھی فروخت کیا جاتا ہے۔ کیا وہ گھی خریدنے آیا ہے بالکل نہیں، وہ ایک عورت کے قریب بیٹھا ہوا ہے، یہ عورت کیوں لیٹی ہوئی ہے یونہی چپ چاپ۔ خاموش۔ اداس۔ یہ بولتی کیوں نہیں، یہ تو کبھی کچھ

نہیں کہتی، یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتی، اس کمرے میں یہ عورت کس طرح آئی، اس کمرے میں یہ ٹرنک کس نے رکھے، چھت پر کس نے جالے بنے، مکھیاں کیوں جالوں میں پھنس جاتی ہیں، اس کا ہاتھ لحاف پر جا پڑا۔ ہاں یہ لحاف ہے، اس کے حواس درست ہیں۔ وہ ابھی تک پاگل نہیں ہوا۔ یہ تکیہ ہے، یہ چادر ہے، اس غلاف پر کس نے بیل بوٹے کاڑھے ہیں، یہ عورت جاتی کیوں نہیں، کیا وہ اس عورت سے کہدے کہ وہ چلی جائے، وہ خود بخود چلی جائیگی، کہاں۔ جدھر اس کا گھر ہے مگر یہ تو بستر پر بے جان، ساکت اور غیر متحرک ہو کر رہ گئی ہے، جیسے یہی اس کا گھر ہے، کیا وہ اس عورت کو اس گھر میں رکھ لے، ان ٹرنکوں کی طرح، ان بوتلوں کی طرح، اس چھتری کی طرح ——— کیا یہ عورت ایک چادر ہے، ایک غلاف ہے، ایک ٹرنک ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ عورت جاتی کیوں نہیں، اس نے نفرت کے احساسات سے مغلوب ہو کر اپنے دل سے پوچھا۔ یہ سوال بار بار اس کے دماغ میں گھومنے لگا۔ پھر اُسے خیال آیا۔ کہ اس عورت کو کچھ دینا چاہیے۔ اس نے دو روپے عورت کے ہاتھ پر رکھے۔

گلاب چلی گئی۔

اور وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے سے باہر

نکل کر اسے محسوس ہونے لگا، کہ ابھی تک اس کے رخسار آتشیں تھے! ابھی تک اس کے جسم میں سے شعلے اٹھ رہے تھے، اس کی حالت اس بھوکے درندے کی طرح تھی، جسے گوشت تو دکھایا جائے لیکن کھانے کو کچھ نہ دیا جائے، اس حالت میں بھوک اور بڑھتی ہے گھٹتی نہیں۔ اب بھی اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا، بہت آگے، وہ دور جانا چاہتا تھا۔ بہت دور ــــــ جہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ گلاب کے برہنہ جسم نے اس کے اندر جنونی کیفیت پیدا کر دی تھی جس سے وہ رہائی حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ اس اندھیرے سے نجات پانا چاہتا تھا، وہ اس زہر کو اگل دینا چاہتا تھا، آج کے واقعہ نے اس کے ذہن اور تخیل کو جہنمی بنا دیا تھا، وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ برف پڑ رہی تھی، اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ لاکھوں روئی کے گالے ستاروں کی طرح گر رہے تھے، وہ چنار کے درخت کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ برف اس کے تپتے ہوئے جسم پر پڑنے لگی، اس کے سر پر، اس کے کانوں پر، اس کے کندھوں پر، اس کے پاؤں پر برف پڑتی گئی، ٹھنڈی اور یخ بستہ! ــــــ ہر طرف پراسرار سکوت تھا، ہر طرف خاموشی تھی، صرف برف پڑ رہی تھی، آسمان پر سپیدی ہی سپیدی

تھی، زمین کی چھتیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں، چغتارے کے پھول برف میں ملفوف ہو گئے تھے اور بالکل سفید دکھائی دیتے تھے، چاندی کے ان آویزوں کی طرح، جو کسی خوبصورت عورت کے کانوں میں لٹکے ہوئے ہوں، صرف ایک چڑیا اپنے پروں کو سکیڑتی ہوئی ایک شاخ سے دوسری شاخ تک چلی گئی، آہستہ آہستہ برف پڑ رہی تھی، خاموش۔ اداس، بے جان، ——— بے کیف، برف ——— اس کے دل کی حرکت اب کمزور ہو چکی تھی، اس کے جسم کا طوفان، وہ غوغائے عظیم، اب برف کی طرح سرد ہو رہا تھا، اور اس کی حالت اس چشمے کی طرح تھی، جس کا تمام پانی یکایک سوکھ جائے، یا جیسے کوئی گونج فضا کی پہنائیوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو جائے۔ اب وہ صرف برف کو دیکھ سکتا تھا۔ سپید سپید برف۔ ٹھنڈی اور یخ بستہ برف۔ اور کچھ نہیں!

⁂

وحشی

رگھبیر نے اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی، وہ نہایت بے صبری سے کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ آنند نے گرم اونی چادر اوڑھ رکھی تھی، رات کا وقت تھا، اور اکتوبر کی میٹھی رسیلی ٹھنڈک جسم میں ایک عجیب ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ آنند کو اس گرم چادر سے ایک قسم کا والہانہ عشق تھا۔ یہ گرم چادر اس کی محبوبہ نے بطور تحفہ آنند کو پیش کی تھی گو اس کی محبوبہ نے ایک اور شخص سے شادی کر لی تھی، لیکن آنند کو اس بات کا رنج نہ تھا۔ کیونکہ اس گرم چادر میں بھی عورت کی سی ملائمت تھی۔ اور اس کی گرمی اور تپش ایک جوان عورت کے جسم سے کم نہ تھی، جب شام پڑتی تو آنند

گرم چادر اپنے گرد لپیٹ لیتا۔ اور کرسی پر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتا اور رگھبیر کی طرف پُرمعنی انداز سے دیکھتا، اور اس کے لبوں کے کونوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ آجاتی، اس وقت آنند نہایت بے صبری سے میز پر جھکے ہوئے میز پوش پر انگلیاں پھیر رہا تھا اور پھر یکایک اس نے آواز دی "ارے منگتو، کھانا کیوں نہیں لاتے۔ پرویز نہایت آرام سے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک شعر گنگنا رہا تھا، اس کے لانبے ریشمی بال کانوں سے نیچے تک رہے تھے، اور اس کے غلافی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمایاں تھی، وہ آنند کی آواز سن کر چونک پڑا، اور پھر میز پر ہاتھ مارتے ہوئے شعر گنگنانے لگا۔ آنند نے پھر زور سے آواز دی، ارے منگتو سالے، کھانا کیوں نہیں لاتے، رگھبیر خاموش کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس نے گردن موڑ کر باہر کی طرف نگاہ ڈالی باہر اندھیرا تھا، چنبیلی کے پھول اس اندھیرے میں بالکل نظر نہیں آتے تھے، صرف ان کی بھینی بھینی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر گم سم بیٹھا رہا۔ لیکن اس کے کانوں کے پردوں سے پھر ایک آواز ٹکرائی، ارے منگتو کھانا کیوں نہیں لاتے۔

منگتو ان تینوں کا نوکر تھا۔ وہ نہایت ہی صاف اور ستھرا رہتا تھا، جب کبھی وہ نکر پہن لیتا۔ اور اپنے بالوں میں کنگھی کرکے کھانا میز پر رکھتا، تو پرویز نوکر کو اس حالت میں دیکھ کر غصہ میں آجاتا۔ وہ منگتو کو خوب گالیاں دیتا تاکہ ہر شخص کو اس بات کا احساس ہوجائے کہ منگتو نکر پہن کر بھی منگتو رہے گا، وہ کبھی نکر پہن کر صاحب نہیں بن سکتا۔ پرویز اکثر نوکروں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ اور منگتو اکثر رگھبیر کے پاس آکر شکایت کر دیا کرتا "دیکھئے صاحب، پرویز صاحب یونہی گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ مانا صاحب کہ ہم نوکر ہیں۔ لیکن ہماری بھی تو عزت ہے۔ ہم بھی تو انسان ہیں۔ آخر آپ لوگ بھی ہیں آپ کیوں نہیں گالیاں دیتے۔ حسین کو تو گالیاں سننے کی عادت ہوگئی ہے لیکن ہم گالیاں برداشت نہیں کرسکتا۔" رگھبیر منگتو کی باتیں نہایت انہماک سے سنتا۔ اور پھر منگتو سے کہتا "دیکھو صاحب کو گالیاں دینے کی عادت ہے۔ بہرحال میں انھیں سمجھا دونگا۔ کہ وہ تمھیں گالیاں نہ دیا کریں۔"

اور آج جب وہ کھانا لانے میں تاخیر کر رہا تھا، تو پرویز غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس نے شعر گنگنانا بند کر دیا تھا اور

وہ باورچی خانے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا، رگھبیر نے آنند کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اس کے سر کے بال کافی اڑ چکے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چند سالوں میں آنند کا سر بالوں سے صاف ہو جائے گا، اب کے منگتو نے میز پر کھانا رکھ دیا۔ آنند نے گرم چادر کو پھر اپنی ٹانگوں کے ارد گرد لپیٹا، اور کرسی پر چوکڑی مار کر روٹی کی طرف لپکا، آنند نے گوشت کی پلیٹ اٹھائی، اور چمچہ ڈال کر گوشت کے ٹکڑوں کو اپنی پلیٹ میں رکھنا چاہا کہ یکایک آنند نے سوچا کہ گوشت نہیں ہے۔ اس نے رگھبیر اور پرویز کی طرف مفکرانہ انداز سے دیکھا اور منگتو کو اتنے زور سے پکارا کہ رگھبیر اور پرویز دونوں چونک اٹھے، اور وہ آنند کی طرف پریشان نظروں سے دیکھنے لگے۔ دونوں نے چمچے میز پر رکھ دیے اور منگتو کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگے، آنند نے منگتو کی طرف چیخ کر کہا۔ اس پلیٹ میں کیا ہے، پرویز نے پرمعنی نظروں سے رگھبیر کی طرف دیکھا۔ اور ایک چھلکتی ہوئی نگاہ گوشت کی پلیٹ پر ڈالی۔ رگھبیر آنند کے پھولے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا آنند غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا، اس کے ہونٹ غصے کی شدت

سے کانپ رہے تھے۔ آنند کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے آنند نے پھر چیخ کر کہا، اس پلیٹ میں کیا ہے منگتو؟" منگتو دروازے میں چپ چاپ کھڑا تھا، اسے صاف دکھائی دیتا تھا کہ پلیٹ میں گوشت ہے، رگھبیر اور پرویز کو بھی صاف نظر آرہا تھا۔ کہ پلیٹ میں گوشت ہے۔ لیکن وہ دونوں خاموش رہے، اور پھر رگھبیر اور پرویز نے بھی محسوس کیا کہ پلیٹ میں گوشت نہیں ہے، اگر پلیٹ میں گوشت ہوتا، تو آنند کبھی یہ سوال منگتو سے نہ کرتا۔ وہ آنند کو اچھی طرح جانتے تھے، آج تک اس نے کبھی ایسی حرکت نہ کی تھی جس سے کسی شخص کو گزند پہنچا ہو۔ اس کا نوکروں کے ساتھ سلوک نہایت ہی اچھا تھا۔ اور جب کبھی پرویز نوکروں کو گالیاں دیا کرتا تھا، تو آنند پرویز کو اپنے پاس بلا کر سمجھاتا، کہ یہ لوگ ہماری ہی طرح انسان ہیں کیا ہوا۔۔ یہ بیچارے غریب ہیں، اور ہمارے ہاں نوکر ہیں، لیکن آج آنند غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا اور منگتو کی طرف قہر آلودہ نظروں سے دیکھ رہا تھا، منگتو زیر لب مسکرا رہا تھا اور پھر وہ کہنے لگا صاحب، کھا کر دیکھئے نا، پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس پلیٹ میں کیا ہے۔

کھاکر دیکھئے نا، آنند نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا میں کہتا ہوں اس پلیٹ میں کیا ہے۔

صاحب کھاکر دیکھئے نا، اور منگتو مسکرانے لگا۔

منگتو کی مسکراہٹ میں ایک طنز تھی، اس کی مسکراہٹ سے صاف عیاں تھا، کہ وہ آقا کے سوال کو نہایت ہی مجہول سمجھ رہا ہے، اور وہ آقا اور نوکر کے رشتہ کو قائم رکھنا نہیں چاہتا، وہ اپنی حدود سے باہر جا رہا تھا۔ یہ تمام باتیں آنند کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوئیں، آنند نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ اور پھر چیخ کر کہا: میں کہتا ہوں اس پلیٹ میں کیا ہے، بولتے کیوں نہیں، منگتو۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔

اور جب منگتو پھر مسکراکر چپ ہو رہا تو آنند کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا، غصے سے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں، ناک کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے، اور چہرے پر وحشت برسنے لگی، وہ کرسی سے اٹھا، اور اس نے منگتو کی طرف گھور کر دیکھا، رگھبیر کو ایسا محسوس ہوا کہ آج آنند منگتو کو جان سے مار دے گا کہ یکایک آنند نے گوشت کی پلیٹ اٹھائی اور زور سے زمین پر دے ماری، گوشت

کی پلیٹ فرش پر گرتے ہی ریزہ ریزہ ہوگئی اور سفید دیوار پر چھیلے چنکبرے داغ پڑ گئے۔ پرویز یہ دیکھ کر آپے سے باہر ہوگیا اس نے منگتو کو خوب گالیاں دیں اور تین چار چانٹے رسید کئے، سالا سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ بڑا بٹلر بنا بیٹھا ہے۔ تین چار اور گھونسے رسید کیے، اور اگر رگھبیر آنند کو پکڑ نہ لیتا تو شاید آنند منگتو کو جان سے مار دیتا۔

رگھبیر کرسی پر بیٹھا ہوا چمبیلی کے پھولوں کی لطیف نرم و نازک خوشبو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گو پلیٹ فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہوگئی تھی اور منگتو باورچی خانے میں زور زور سے رو رہا تھا۔ پھر رگھبیر نے پرویز اور آنند کی طرف دیکھا، آنند خشک روٹیوں کی طرف ذرد دیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور پرویز اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے دبا رہا تھا۔ شاید پرویز کے ہاتھ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا، منگتو کو اتنے زور سے چانٹے پڑے تھے کہ پرویز کا ہاتھ اس درد سے ہم آہنگ ہو رہا تھا، پرویز نے مسکراتے ہوئے آنند کی طرف دیکھا۔ اور پھر غصے سے منہ پھلا کر کہنے لگا۔ سالا کہتا ہے، بابو صاحب، وہیں کھڑے رہئے، اب نہ ماریئے میں آپ کی عزت کرتا

ہوں، نہیں تو ـــــــ میں اسے جان سے مار دیتا، اگر رگھبیر مجھے نہ چھڑاتا۔ حرامی، وہ دن بھول گیا جب سوکھا سڑا، بھیک مانگتا ہوا ہمارے پاس آیا تھا، اور کہتا تھا۔ بابو جی مجھے نوکر رکھ لیجیے، کیا میں نے ایک بار بھی اس سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو۔ کہاں رہتے ہو۔ پہلے کہاں کام کرتے رہے ہو، کیا میں نے کوئی ضمانت مانگی تھی۔ اور میں نے بغیر سوچے سمجھے اسے نوکر رکھ لیا تھا، اور آج کہتا ہے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ نہیں تو ـــــــ بڑا آیا گاما پہلوان، ایک گھونسا ماروں تو بتیس دانت باہر نکل آئیں۔

باورچی خانے سے منگتو کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ کمرے میں بجلی کی روشنی زرد ہوگئی تھی، اور باہر اندھیرا زیادہ گہرا ہوگیا تھا، رگھبیر نے زور زور سے سانس لینا شروع کیا، لیکن چمبیلی کے پھولوں کی خوشبو اب ندارد تھی، صرف ٹھنڈی، خشک ہوا، اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔

"دراصل پلیٹ میں گوشت ہی تھا۔" آنند نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔" اور وہ اپنے بالوں میں چھوٹی چھوٹی انگلیاں پھیرنے لگا۔ اب آنند مضمحل اور افسردہ نظر

آتا تھا۔

"پلیٹ میں گوشت ہی تھا، اور کیا ہو سکتا ہے"

پرویز نے قہر آلود نظروں سے آنند کی طرف دیکھا۔

"پلیٹ میں تھا ہی گوشت" رگھبیر نے لفظ گوشت پر زیادہ زور دیا۔

"مجھے آج کے واقعہ پر زیادہ افسوس ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا، یہ جانتے ہوئے کہ پلیٹ میں گوشت ہے، مجھے یوں خیال آگیا کہ پلیٹ میں گوشت نہیں ہے۔" آنند نے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی جانتا تھا، بلکہ دیکھ رہا تھا کہ پلیٹ میں گوشت ہے، لیکن میں بھی چپ رہا، اور تمھاری طرف دیکھتا رہا اور یہی خیال کرتا رہا کہ تم خود بخود سمجھ جاؤ گے۔ بچارے کو یونہی مار پڑی، بھلا منگتو کا اس میں کیا قصور تھا" رگھبیر نے سوکھی روٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اُس نے بتایا کیوں نہیں کہ پلیٹ میں گوشت ہے۔" آنند نے چمک کر کہا۔

"ہاں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ آنند منگتو سے پوچھ رہا ہے کہ اس پلیٹ میں کیا ہے، اور منگتو کو معلوم ہے کہ صاحب غصے میں ہیں، لیکن پھر بھی پاجی مسکرا رہا ہے، جیسے وہ صاحب کے غصے کی پروا نہیں کرتا" پرویز نے لال پیلا ہو کر کہا۔

"شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں" گمبھیر نے گرم چادر کو مسلتے ہوئے کہا۔

"نوکروں سے کون مذاق کرتا ہے" پرویز نے گمبھیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن غلطی تو میری ہے، جب پلیٹ میں گوشت ہی تھا تو یہ سوال کرنا کتنی بیہودہ بات تھی" آنند نے گرم چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کم از کم وہ بات کا جواب تو دیتا" پرویز نے اونچی آواز میں کہا۔

"ہاں یہ اس کی غلطی ہے" آنند نے دبی زبان میں کہا۔

"بچارے نوکروں پر اتنا ظلم نہیں کرنا چاہیے

اگر ان کا قصور ہو تو تم بے شک انھیں برا بھلا کہہ سکتے ہو۔ لیکن نوکروں کو مارنا کہاں کا انصاف ہے' یہ سراسر درندگی ہے اور کچھ نہیں۔" رگھبیر نے آہستہ آہستہ یہ الفاظ کہہ دیے۔

"ارے یار رہنے بھی دو' بڑے آئے گاندھی اب لگے اشتراکیت کا پرچار کرنے ۔ نوکروں پر ظلم نہ کرو' یہ نہ کرو' وہ نہ کرو ۔ میں ان باتوں کا قایل نہیں' ان باتوں سے ہندوستان کو آزادی نہیں مل سکتی۔" پرویز نے سر کو جھٹک کر یہ الفاظ کہے ۔ رگھبیر یہ جواب سن کر خاموش ہوگیا' وہ آنند کی طرف دیکھ رہا تھا' جو کرسی پر بیٹھا ہوا اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا ۔

اور جب صبح ہوئی' اور سورج کی کرنیں چنبیلی کے سفید پھولوں کو چومتی ہوئی رگھبیر کے کمرے میں آئیں' تو رگھبیر نے سوچا کہ منگتو نوکری چھوڑ کر بھاگ گیا ہوگا' اور اگر وہ فرار نہیں ہوا تو وہ رگھبیر کے پاس ضرور آئے گا' اور اس سے کہے گا کہ صاحب میں آج جا رہا ہوں' میں اس وحشیانہ سلوک کو برداشت نہیں کر سکتا' یہ انسانیت نہیں درندگی ہے

آپ ہی بتائیے' میرا کیا قصور تھا۔ صاحب کیا پلیٹ میں گوشت نہ تھا' اور دراصل صاحب' میں پرماتما کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اُس وقت میں یہی سمجھتا رہا کہ آنند صاحب مذاق کر رہے ہیں' اور اس مذاق میں پرویز صاحب نے پیٹنا شروع کیا۔"
لیکن اُس رپیٹ کے بعد نہ منگتو آیا' اور نہ ہی اس نے نوکری چھوڑی' رکھبیر کو اس بات پر بہت غصہ آیا۔ اور اس نے دل میں خیال کیا' یہ منگتو بھی کمینہ ہے۔ اسے اپنی بے عزتی کا پاس نہیں۔ اس میں خود داری کا رتی بھر مادہ نہیں' اگر اسے ذرا بھی اپنی عزت کا احساس ہوتا۔ تو وہ ضرور گھر چلا جاتا اُسے منگتو سے ہمدردی تھی' رکھبیر چاہتا تھا' کہ وہ منگتو سے آنند اور پرویز کے وحشیانہ سلوک کے متعلق معافی مانگ کر اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرلے' لیکن اس نے پھر سوچا' کہ معافی مانگنے سے کیا ہوگا' لیکن منگتو کے لیے اس کے دل میں ہمدردی ضرور تھی' لیکن منگتو کمینہ ہے' اگر وہ منگتو کی جگہ ہوتا' تو وہ کب کا نوکری چھوڑ کر کہیں اور چلا جاتا' چاہے اسے فاقے کرنے پڑتے' اور اگر ایک دو دن ان صاحب لوگوں کو خود کھانا پکانا پڑے' تو انھیں ضرور اپنی کمینگی کا

احساس ہو جائے۔

اور پھر منگتو بیمار ہو گیا۔ بیماری سے پہلے، وہ بڑی شان سے کہا کرتا تھا، کہ اسے کبھی بخار نہیں آتا، اور اگر بخار آ بھی جائے، تو وہ بخار کی پرواہ نہیں کرتا وہ آسام میں رہ چکا تھا، جہاں ملیریا سے ہزاروں لوگ مرجاتے ہیں۔ اسے وہاں بھی دو تین بار بخار آیا تھا، لیکن اس نے بخار کی کبھی پرواہ نہ کی تھی، اور اکثر بخار میں گھر کا کام کاج کرتا رہتا تھا، دراصل اس کی مالکہ بہت اچھی تھی، جب کبھی وہ بیمار ہو جاتا، تو فوراً اس کی مالکہ اُسے آرام کرنے کے لیے کہتی بیٹا اب تم کام نہ کرو، جاؤ، سو رہو، اور پھر وہ چائے بنا کر پلاتی اور دوسرے نوکر کو بھیج کر دوا منگواتی۔ اور بڑے پیار سے اسے دوائی پلاتی۔ وہ آسام میں چھ سال رہا تھا۔ اور جنگ شروع ہوئی تو اس کی مالکہ وہاں سے بھاگ آئی۔ اور ناچار اسے بھی وہاں سے آنا پڑا۔ منگتو کو بخار چڑھا تو رگھبیر کو ایک گونہ مسرت ہوئی، کیونکہ جب رگھبیر بیمار ہوتا تھا، تو منگتو چلا چلا کر رگھبیر کی کی کمزور صحت کے متعلق فقرے کہا کرتا تھا۔ صاحب آپ کی

صحت بہت ہی کمزور ہے۔ دیکھیے نا، ایک دو دن کے بخار سے آپ کا کیا حال ہوگیا، اور آپ کا رنگ زرد ہوگیا ہے۔
میں تو ان بخاروں کی پرواہ نہیں کرتا۔

اور اب وہی منگتو، سر پر رومال باندھ کر باورچی خانے میں کراہ رہا تھا۔ پرویز اور آنند گھر میں نہیں تھے۔ وہ چند دنوں کے لیے باہر گئے ہوئے تھے، اور اب رگھبیر اکیلا تھا۔ اور منگتو بیمار پڑا ہوا تھا، شروع شروع میں انسانی ہمدردی کے جذبے کے زیر اثر وہ منگتو کو کونین کھانے کے لیے کہتا رہا۔ دیکھو منگتو یہ ملیریا ہے۔ زیادہ چلّانے کی ضرورت نہیں، جب بخار ٹوٹ جائے تو کونین کی گولیاں مجھ سے مانگ لینا۔ لیکن منگتو کا بخار نہ ٹوٹا اور وہ ساری رات کراہتا رہا۔ اور جب صبح ہوئی تو اس نے منگتو کی نبض دیکھی۔ بخار بدستور تھا۔ اس نے باورچی خانے میں جابجا تھوک دیا تھا، باورچی خانے کا یہ حال دیکھ کر رگھبیر منگتو سے نفرت کرنے لگا، سالا، باورچی خانے سے باہر جا کر نہیں تھوکتا۔ بڑا نواب زادہ بنا بیٹھا ہے۔ لیکن وہ بیمار ہے، اس نے سوچا، اور اس طرح دل کو ڈھارس دیتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

آج پانچ چھ دن ہو گئے تھے۔ کہ منگتو کا بخار نہ ٹوٹا تھا۔ جب کبھی بخار ذرا ہلکا ہوتا، تو پھر یہ دی لگ کر اور تیز ہو جاتا منگتو تمام دن باورچی خانے میں پڑا رہتا، اور کراہتا رہتا۔ اب رگھبیر منگتو سے نفرت کرنے لگا تھا۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ آہستہ آہستہ نفرت میں مبدل ہو رہا تھا، شام کو رگھبیر اپنے کمرے میں آیا، تو منگتو کو اس نے اپنے کمرے میں لیٹا ہوا پایا۔ وہ اس کے قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ اٹھ بیٹھا، اور کہنے لگا۔ صاحب باورچی خانے میں سخت سردی تھی اور میرے سارے جسم میں درد ہو رہا تھا، اس کمرے میں ہوا کم تھی، اور کچھ گرم سا معلوم ہوتا تھا، اس لیے میں یہاں چلا آیا، کیا میں رات بھر یہاں سو سکتا ہوں، اور پھر وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کھانستے کھانستے آنسو آ گئے، اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا، بابو صاحب میں مر جاؤں گا میرا سر درد سے پھٹا جاتا ہے، میرے سر پر ہاتھ رکھنے دیکھیے نا کتنا تیز بخار ہے، ہاں بخار تو بہت تیز ہے، رگھبیر نے جھجکتے ہوئے منگتو کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، لیکن تم اس کمرے میں سو نہیں سکتے، میں رات کو اکثر لکھتا ہوں، اس لیے بجلی کی

روشنی میں تم کس طرح یہاں سو سکو گے۔ یہ الفاظ کہہ کر رگھبیر چپ ہو گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ منگتو کو کیا حق ہے، کہ وہ اس کے کمرے میں سورہے، باورچی خانے میں کیوں نہیں سوتا، بڑا آیا لاٹ صاحب، آج اس کمرے میں سونا چاہتا ہے، کل اس چارپائی پر سونے کے لیے کہے گا نمک حرام۔" تھوڑی دیر کے بعد منگتو گرتا پڑتا باورچی خانے میں چلا گیا، اور زور زور سے رونے لگا اور کہنے لگا۔ ماں۔ ماں۔ میں تم پر بھروسہ کرتا تھا، لیکن تم بھی اس بیماری میں میرے پاس نہیں آئیں۔ ماں میں آج مر جاؤں گا میں آج رات کے آٹھ بجے مر جاؤں گا

رگھبیر نے یہ الفاظ سنے۔ تو اسے اس دن معلوم ہوا، کہ منگتو کی ماں زندہ ہے، شاید اس کا باپ بھی ہو گا، شاید اس کی بہن بھی ہو گی، لیکن وہ کہاں ہیں، وہ کیوں منگتو کی تیمارداری نہیں کرتے، کیا اس نے منگتو کی تیمارداری کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، سالا، جب سے بیمار ہوا ہے، تقریباً بیس روپے تو خرچ ہو گئے ہیں، لیکن پھر رگھبیر نے سوچا، "آنند کی بیماری پر دو سو روپے خرچ ہوئے تھے، اور پروین نے آنکھوں کا معائنہ کرانے کے لیے صرف پچیس روپے فیس دی

تھی، اور جب رگھبیر بیمار ہوا تھا، تو آنند نے کس تن دہی سے تیمار داری کی تھی، ہر روز ڈاکٹر دیکھنے آتا تھا، اور ایک نرس اسے دوائی پلاتی تھی، اور نرس بھی کتنی خوبصورت تھی، اس کی باتیں کتنی دلچسپ تھیں، اسے دیکھ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا، اور بخار خود بخود کم ہونے لگتا تھا، اصل تیمارداری تو ایک عورت ہی کر سکتی ہے، عورت کی باریک نسوانی آواز اس کے لبوں کی ہلکی مسکراہٹ، اس کی پلکوں کا کچھ عرصہ کے لیے جھکے رہنا، اس کی نرم، گداز انگلیوں کا لمس بیمار کو ایک سکون بخشتا ہے ـــــ اور آج منگتو بیمار ہے، کیا وہ منگتو کے لیے نرس نہیں رکھ سکتا۔ جو منگتو کی تیمار داری کرے۔ جس کے حسن اخلاق، جس کی باتوں، جس کے لمس سے منگتو کو اپنی ماں کی شفقت اور پیار کا احساس ہو سکے اس کا دل جو اکثر انسانی آزادی اور اخوت کے لیے بے چین رہتا تھا۔ آج یکایک نفرت کے بادلوں سے بھر گیا تھا، کیا وہ منگتو کی ماں اور باپ کو تار دے کر نہیں بلا سکتا، تاکہ وہ اپنے جوان بیٹے کو مرتے ہوئے تو دیکھ لیں۔ لیکن منگتو مر نہیں سکتا، اس کی ہڈی بہت ہی مضبوط ہے، وہ آسام میں رہ چکا ہے، جہاں

ہر سال ہزاروں لوگ — ملیریا کی نذر ہو جاتے ہیں اگر وہ آسام میں نہیں مرا، تو اب بھلا کیسے مر سکتا ہے۔

منگتو باہر قے کر رہا تھا، اور رگھبیر کا جی متلا رہا تھا، قے کرنے کے بعد منگتو دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں آیا، اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر رونے لگا، صاحب میں مر جاؤں گا میں اب زندہ نہیں رہ سکتا، مجھے ہسپتال میں بھیج دیجیے، میں نے چھ دنوں سے کچھ نہیں کھایا، مجھے یہاں کوئی پانی پلانے والا بھی نہیں، میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ کاش کوئی میرا سر دبا سکتا، صاحب باورچی خانے میں اتنی سردی ہے کہ وہاں انسان بیٹھ نہیں سکتا، درد جسم کے نس نس میں بھرا پڑا ہے، پرماتما کے لیے مجھے ہسپتال بھیج دیجیے، اور وہ زور زور سے رونے لگا۔ اس کی آنکھیں ہلدی کی طرح زرد تھیں، پہلے سے زیادہ دبلا اور مدقوق نظر آ رہا تھا، اس کی زرد آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں، اور پھر وہ زور زور سے سانس لینے لگا، اور وہیں بیٹھے ہوئے اس نے قے کی، رگھبیر دیکھ کر غصے سے آگ ہو گیا، اس کے جی میں آیا کہ منگتو کو کمرے سے باہر پھینک دے اور دھکے دے کر ہمیشہ کے لیے گھر سے باہر نکال دے۔ گندا کمینہ

اجڈ، گنوار، سارا قالین تباہ کر دیا، حرامزادے نے ـــــــ وہ چاہتا تھا کہ پاؤں کی ٹھوکر مار کر منگتو کو باورچی خانے میں پہنچا دے لیکن اس نے اپنی بڑھتی ہوئی ٹانگ کو پیچھے ہٹا لیا، اور جب منگتو اپنے کمرے میں چلا گیا، تو اس کے دل میں ہمدردی کا چشمہ پھوٹ پڑا، وہ چاہتا تھا، کہ منگتو کے پاس جا کر اس کا سر دبائے، اسے پانی پلائے اس سے یہ کہہ دے کہ تمھاری ماں آرہی ہے، تمھارا باپ ابھی تک زندہ ہے، اور جلد ہی آجائیگا تمھاری بہن تمھیں دیکھنے کے لیے کتنی بے قرار ہے، تم بھی میری طرح انسان ہو، فرق صرف یہی ہے کہ تمھارا نام منگتو ہے، اور میرا نام (R. R. Raghbir) ہے۔

وہ رات بھر نہ سو سکا، اور جب صبح ہوئی، اور کھڑکی میں سے صبح کی تازہ ٹھنڈی ہوا، اس کے کانوں کو چھوتی ہوئی کمرے میں پھیل گئی تو وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا، اور منگتو کو آواز دی، لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ دوڑتا ہوا منگتو کے کمرے میں گیا، منگتو کمرے میں لیٹا ہوا تھا، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، اس نے زور سے آواز دی، منگتو، ارے منگتو، لیکن

کوئی جواب نہ آیا، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اس نے نبض دیکھی، نبض بالکل بند تھی، صرف آنکھیں کھلی تھیں۔ شاید اب بھی وہ کسی کا انتظار کررہی تھیں، لیکن انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں منگلتو کا چہرہ بھیانک ہوگیا تھا، اس کے لب سکڑ گئے تھے اور چہرے کی جلد سیاہ ہوگئی تھی۔ رگھبیر نے اس کی آنکھیں بند کردیں، کم از کم موت کے بعد تو یہ آنکھیں آرام کرسکیں، اور سر سے لے کر پاؤں تک اس نے ایک چادر منگلتو پر ڈال دی، اور اس دن اسے احساس ہوا، کہ وہ پرویز اور آنند سے بھی زیادہ کمینہ ہے وہ ایک وحشی ہے!



ہمالیہ کی چوٹی

یہ دو سال کی بات ہے کہ وائس چانسلر نے
میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ دیتے ہوئے کہا۔ "آج میں
تمھیں وہ انعام دیتا ہوں جس کے لیے تم ساری عمر سرگرداں
رہے۔ اس کاغذ کے ٹکڑے پر میں تمھیں بی۔ اے کی ڈگری
دیتا ہوں۔ اس ڈگری سے تم ایک اعلیٰ نوکری حاصل کرسکو گے
اور اس کے بعد تم ایک لڑکی خرید سکو گے۔ جس سے شادی
کرکے تم اسّی بچے پیدا کرسکتے ہو۔ تاکہ ہندوستان کی آبادی اور
افلاس میں اور اضافہ ہوسکے۔
میں نے یہ کاغذ کا ٹکڑا لے لیا اور اسے دوہرا
کرکے جیب میں ڈال لیا۔ اس کاغذ کے ٹکڑے کو پاکے میں بہت

خوش ہوا۔ ہر طرف زندگی ناچتی ہوئی نظر آئی۔ ستارے خوشی سے گا رہے تھے۔ اور فرشتے میری کامیابی پر پھول برسا رہے تھے میں نے دیکھا کہ لوگ میرے پاس آ آکے کہہ رہے ہیں۔ یہ نوکری لے لو۔ وہ نوکری لے لو۔ لیکن میں انھیں یہی جواب دیتا ہوں بھئی ٹھہر جاؤ۔ ذرا غور کر کے جواب دونگا۔"

میں نے دیکھا کہ کئی لوگ اپنی لڑکیاں میرے ساتھ بیاہنے کے لیے تیار ہیں اور اپنی لڑکیوں کی تعریف کرتے کرتے انھوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔

"اجی میری لڑکی رتن پاس ہے رتن سینا پرونا جانتی ہے لگا تار دس گھنٹے کام کر سکتی ہے۔"

"اجی میری کملا۔ وہ تو دسویں پاس ہے۔ اسے ہندی آتی ہے۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ مدراسی تلگو زبان بھی جانتی ہے۔" میں نے سوچا کہ ایسی بیوی ضرور ہونی چاہیے۔ کیونکہ پھر کسی ترجمان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

"اجی میری کملا۔ وہ تو بی۔ اے پاس ہے خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کتنی قابل اور ذہین ہے۔ وہ تو سوسائٹی گرل ہے۔ اس کے حسن کے متعلق کچھ نہ پوچھیے۔ اس کا قد

ڈاروتھی لیمر کا سا ہے۔ ناک گریٹا گاربو جیسی۔ اس کے ہونٹ مارلین ڈیٹرچ کے ہونٹوں کے مانند ہیں" میری لڑکی! وہ تو سادگی کا مجسمہ ہے۔ ایک جیتی جاگتی سیتا۔ آپ کو خوش رکھے گی۔ اور ہر سال ایک خوب صورت بچّہ دے گی۔ اور پھر وہ شوہر کے انتظار میں ساری رات جاگ سکتی ہے"

میں نے سوچا یہ بھی کتنی خوبی ہے کہ بیوی تو تمام رات جاگتی رہے اور شوہر باہر گلچھرّے اڑائے۔ اور پھر ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ محلّے میں پہرے دار کی ضرورت نہیں رہتی

یہ سہانے خواب بنتے اور مٹتے رہے ایک سال اور گزر گیا نہ نوکری ملی اور نہ بیوی۔ پہلے پہل میں نے گورنمنٹ کی نوکری کے لیے دوڑ دھوپ کی۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی خامی نکل آتی۔ پہلی اسامی اس لیے نہ ملی کہ میں غیر زراعت پیشہ نکلا۔ دوسری جگہ سے اس لیے محروم رہا کہ میں اشتراکی ہوں۔ تیسری جگہ اس لیے نہ دی گئی کہ ڈاکٹروں نے مجھے نوکری کے ناقابل قرار دے دیا۔ اور چوتھی اسامی اس لیے ہاتھ نہ آئی کہ میرے باپ دادا نے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں سرکار عالیہ کی کوئی خدمت نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ لڑائی کے فنڈ میں بھی کوئی پیسہ نہ دیا تھا۔ اس

کے بعد میں نے پرائیویٹ کمپنیوں میں درخواستیں دیں۔ یہاں بھی دال نہ گلی۔ اگر کمپنی کا مالک ہندو ہو تو مجھے مسلمان کہہ کر نکال دیا گیا اور اگر کمپنی کا مالک مسلمان نکلا تو مجھے ہندو سمجھ کے دھتا بتادی گئی۔ اور اگر کمپنی کا منیجر اگروال نکل آیا تو مجھے موہیال قرار دے کر نکال دیا گیا۔ اور اگر کمپنی کا مالک کھتری ہوا تو مجھے ہری جن سمجھ کے دھکّے دئے جاتے غرضکہ ہر طرف سے یہی آواز آئی کہ یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔

میرا مطلع حیات مکدّر ہوگیا اور میری زندگی کے افق پر تاریکیاں چھاگئیں۔ میں غم زدہ اور افسردہ رہنے لگا۔ زندگی سے تنگ آکر میں نے سنیاسی بننے کی ٹھانی سبھاش بوس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے :" ہمالیہ کی چوٹیاں مجھے بلا رہی ہیں۔ دور۔ دور۔......... جنگل کی فضائیں یاد کر رہی ہیں مجھے "

ہندوستان کے ہر فرد کی عادت بن چکی ہے کہ جب وہ زندگی کے مسائل حل نہیں کرسکتا تو وہ جنگل کا رُخ کرتا ہے۔ سبھاش بوس کی مثال لیجیے۔ یہ جواں ہمت لیڈر گاندھی جی کے اصولوں کو گوارا نہ کرسکا تو اس کے خلاف علم جہاد بلند کردیا

گاندھی جی نے اسے کانگرس سے باہر نکال دیا۔لیکن سبھاش بوس پھر بھی لڑتا رہا۔آخر اسے ہار ماننی پڑی۔اس کی جسمانی اور دماغی طاقتیں لڑ لڑ کے تھک چکی تھیں اس نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ سیاست کو خیرباد کرکے سنیاسی بن جائے۔تو ہاں سبھاش بوس نے یہی کیا جو ہر ہندوستانی کرتا ہے! ورمیں بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔لیکن انسان عادت سے مجبور ہے۔اس لیے میں جھٹ اپنے گرو کے پاس پہنچا۔تاکہ اندرونی روشنی پاسکوں۔میرا گرو کالج کا ایک پروفیسر ہے۔اس سے میں نے اپنی دکھ بھری داستان کہہ ڈالی۔میری کہانی سن کر وہ بالکل پریشان نہیں ہوا۔اور نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا۔میں تمہیں ایک بات بتا سکتا ہوں۔جس سے تم ان تمام تکلیفوں سے نجات پاسکوگے۔

"خدارا جلد کہیے۔" میں نے کہا

"ایم۔اے میں داخل ہو جاؤ۔" پروفیسر نے دبی زبان میں کہا۔

میں یہ الفاظ سن کر بہت حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ کہیں پروفیسر مجھے اُلو تو نہیں بنا رہا۔ تھوڑے وقفے

کے بعد پروفیسر کہنے لگا۔ تم۔ تم۔ ذہین دکھائی دیتے ہو۔ تم پروفیسر بن سکتے ہو۔ تمھاری شکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ایم۔ اے کی ڈگری پانے کے قابل ہو۔

"پروفیسر" میں نے دبی زبان میں کہا۔ یہ نام سنتے ہی میرے منھ میں پانی بھر آیا۔ کتنا حسین اور پیارا لفظ ہے۔ کتنی کشش ہے اس لفظ میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی کی تمام راحتیں اسی ایک لفظ میں سمائی ہوئی ہیں۔ اور پروفیسر کی زندگی کتنی شاندار ہوتی ہے۔ جو دل میں آئے کہے جاؤ۔ پھر بھی طلباء عزت کرتے ہیں اور لیکچر ختم ہونے پر تالیاں بجاتے ہیں۔ غرض لفظِ پروفیسر نے مجھ پر ایک جادو سا کر دیا۔ میں نے جھک کر پروفیسر سے کہا۔ میں ایم۔ اے میں داخل ہو جاؤں گا۔"

"ہاں ہاں۔ تم پروفیسر بن سکتے ہو۔ ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تمھارا کسی مقامی کالج میں پروفیسر مقرر ہو جانا بہت آسان ہے۔ نہیں تو کسی گرلز کالج کی پروفیسری ہی سہی۔"

"کیا کہا آپ نے گرلز کالج - یعنی لڑکیوں کے کالج کی پروفیسری مل گیا - وہ بھی کتنی حسین اور پُرکیف زندگی ہوگی - ہر وقت خوب صورت، جوان، حسین لڑکیوں کی قطاریں دیکھتے جاؤ - اور جو جی میں آئے بکے جاؤ لیکن لڑکیاں عزت کریں گی - تالیاں بجائیں گی - اور پھر......... اگر ہو سکے تو محبت ———— پھر بھی"

"کیا کہا تم نے"؟ پروفیسر نے زور دار لہجے میں کہا -

"یہی کہ اگر ہو سکے تو کسی لڑکی سے رومانی محبت.........."

"جوان لڑکیوں کے متعلق باتیں کرنا ہندوستانی تہذیب کے خلاف ہے - لڑکیاں فرشتوں کے لیے ہوتی ہیں - لڑکوں کے لیے نہیں - کیا تم نہیں جانتے کہ ہم ذہنی طور پر ابھی تک ملکۂ وکٹوریہ کے عہد سے گزر رہے ہیں"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "ارے صاحب ملکۂ وکٹوریہ کب کی مر چکیں - اب تو مسز سمپسن اور ایڈورڈ ہشتم

کا زمانہ ہے۔"

"ان باتوں کو بھول جاؤ۔ جنسی مسایل کے متعلق کچھ مت کہو۔ عدم تشدد کا ذکر کرو۔ ہاں تم لوگ ابھیاس کے متعلق بھی بات چیت کر سکتے ہو۔ اور ہو سکے تو برہمچریہ کے متعلق کچھ کہو۔ جاؤ میاں جاؤ۔ ایم۔ اے میں داخل ہو جاؤ۔"

اپنے گرو کے حکم کے مطابق میں ایم۔ اے میں داخل ہو گیا۔ متواتر دو سال سے ایم۔ اے کی تیاری کر رہا ہوں۔ میرے ہم جماعت عجیب انسان ہیں۔ ناامیدی۔ بے کاری۔ تجرّد۔ ان کے چہروں پر لکھا ہے۔ وہ سب کے سب میری طرح دھکے کھا رہے ہیں۔ انھوں نے نوکری کی تلاش میں جگہ جگہ کی خاک چھانی ہے۔ شہر شہر کا پانی پیا ہے۔ لیکن واہ ری قسمت نہ نوکری ملی اور نہ بیوی۔

ان کے چہرے زرد ہیں۔ ان کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ سر کے بال اڑ گئے ہیں اور اُن کی شکلیں بھتنوں سے ملتی جلتی ہیں۔ ان کی جوانی

نشو و نما پانے سے پہلے فنا ہی ہوگئی ۔ ان کے چہروں سے بھوک اور فاقہ مستی ٹپکتی ہے ۔ ہاں ایک لفظ نے انھیں پاگل بنا دیا ۔ اور وہ لفظ ہے پروفیسر ۔ ان نوجوانوں نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا ۔ اپنے ماں باپ کو بھی اور سوچے سمجھے بغیر اس اندھی مشین کے پرزے بن گئے ۔ جوان کی امنگوں ۔ امیدوں اور خواہشوں کو کچلتی اور انھیں ایک بے جان تعلیم دیتی ہے ۔ یہ مشین یا تو انھیں جن بنا دیتی ہے ۔ یا صرف بونے ۔ صاف ظاہر ہے یہ لوگ انسان نہیں رہتے ۔ پھر بھی یہ نوجوان امید کے سایے تلے پلتے ہیں ۔ ہوائی قلعے بناتے ہیں اور لفظ "پروفیسر" کی مالا جپتے ہیں ۔

لیکن ان باتوں کے باوجود ہم سب ایک بات میں ملتے ہیں ۔ اور وہ یہ ہے کہ ہماری قسمت ایک ہے ۔ ہمارا مستقبل ایک ہے ۔ ہمارا انجام ایک ہے ۔ مجھے اپنے انجام کی فکر ہے ۔ دو سال ختم ہونے کو ہیں ۔ اس کے بعد کیا کروں گا ؟ وہی پرانے چکر وہی پرانی آوازیں : " آپ غیر زراعت پیشہ ہیں ؟

آپ کی آنکھیں کمزور ہیں۔ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ آپ کا جگر بڑھا ہوا ہے۔ آپ کے باپ دادا کی کوئی سروس نہیں۔ آپ کی سفارش کوئی نہیں۔ میاں یہاں کوئی جگہ نہیں۔"

میں اس زندگی سے بیزار ہوں۔میری زندگی کا ساز ٹوٹ چکا ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے اس وقت سبھاش بابو یاد آرہا ہے۔ ہمالیہ کی چوٹیاں مجھے اپنے پاس بلا رہی ہیں اور پھر........ کبھی کبھی اپنا گرو۔



دہلیز

پہلی بار جب ہم دونوں بھائی سلگام گئے، تو چاروں طرف سے "سلاموں" کی بوچھاڑ ہونے لگی، گھر پہنچے، تو عورتوں کا انبوہِ کثیر دیکھا، گاؤں کی تمام عورتیں ہمیں دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ تحصیلدار صاحب کے لڑکے لاہور سے آرہے ہیں، اُن کی شکل و صورت کیسی ہوگی، وہ کیا پہنتے ہوں گے، وہ کس طرح گفتگو کرتے ہوں گے۔ غرضکہ عورتوں نے ہمیں دیکھا، اور ہم نے اُنھیں دیکھا، جیسے سیزر کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ آیا، اُس نے دیکھا، اور فتح کرلیا، یہی بات ہم نے کی، یعنی ہم آئے، ہم نے دیکھا، اور فتح کرلیا، کیونکہ عورتوں کی مجموعی رائے یہ تھی کہ "لڑکے اچھے ہیں۔"

سلگام ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ نہایت خوبصورت اور زرخیز۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ، نظر آتے ہیں، ان کی چوٹیاں سردیوں میں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ مشرق سے جب سورج کی اولین کرنیں، ان سرسبز، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو چوم کر، کچے گھروں میں داخل ہوتی ہیں، تو گاؤں کی الھڑ لڑکیاں برامدوں میں بیٹھ کر دھوپ سینکتی ہیں، ان کے نرم گدرائے ہوئے جسموں میں سورج کی کرنوں کی تپش آہستہ آہستہ سرایت کرتی ہے، اور وہ نیند سے بوجھل آنکھوں کو کھول کر ادھر اُدھر دیکھتی ہیں، اور زندگی کی ایک نئی لذت سے آشنا ہوتی ہیں۔ گاؤں میں ان سرسبز کھیتوں، اونچے اونچے پہاڑوں، اور جوان لڑکیوں، اور بوڑھی عورتوں کے علاوہ ایک ڈاکٹر، ایک تحصیلدار، ایک تھانیدار، ایک پوسٹ ماسٹر ریاست کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی چار افسر تحصیل کی قسمت کے مالک ہیں۔ گاؤں کی حالت کو سدھارنا انہی کے ہاتھ میں ہے، میرے والد ریاست کی طرف سے اِس گاؤں میں تحصیلدار تھے، اس لیے گاؤں میں ہماری کافی عزت تھی، اِس پر طرہ یہ کہ ہم دونوں بھائی ٹوپ پہنتے تھے، اور ٹوپ پہننے والے

گاؤں میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، اور پھر
عورتوں کی مجموعی رائے یہ تھی۔ کہ "لڑکے اچھے ہیں۔"

ایک دوپہر کا ذکر ہے، کہ ہم دونوں بھائی سیب
کے درخت کے نیچے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے، سورج کی
تیز، نوکیلی کرنیں، سیب کے پتوں سے چھن کر ہمارے جسموں
پر پڑتیں اور ہم جھنجھلا کر ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ جاتے
کبھی کبھی تیز ہوا کا جھونکا آتا، تو ہمیں تھوڑی بہت تسکین ہوتی،
اور پھر کوئی سڑا گلا پتہ سر پر آگرتا، یا کوئی نرم، گیلا سا، لجلجا کیڑا
پاؤں پر خراماں چلتا، تو جی بہت گھبراتا، دلوں میں عجیب سا
اضطراب تھا، اور ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ جیسے کبھی کچھ بھی
نہیں ہوتا۔ جیسے کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے، اور کبھی کچھ نہ ہوگا
اس ٹھہری ہوئی، بے جان، بے کیف زندگی میں حرکت کی
ضرورت تھی، اور جب زندگی محبت سے خالی ہو، تو یوں ہی
غصہ آتا ہے، اپنے آپ پر۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی کان میں آکر
کہہ دے، کہ گاؤں کی تمام لڑکیاں تم پر مرتی ہیں،
جب تم سر پر ہیٹ رکھ کر، گلے میں ٹائی لگا کر، اور

نیلی پتلون پہن کر چلتے ہو، تو گاؤں کی ہر نوجوان لڑکی کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے، وہ تم سے باتیں کرنا چاہتی ہیں، لیکن وہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں، کاش اس زندگی میں انقلاب آجاتا، اور دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، جیسے وہ ایک دوسرے کے خیالات اور احساسات کو سمجھ رہے ہیں کہ اتنے میں چونی لعل آگیا۔

میں نے ملائم، سرسبز گھاس پر ٹانگیں پھیلا کر کہا کہو، چونی۔ کیا بات ہے۔

چونی لعل میری طرف دیکھنے لگا، وہ چاہتا تھا۔ کہ میں یہاں سے چلا جاؤں لیکن میں کب جانے والا تھا، آخر تنگ آکر چونی لعل کہنے لگا۔

یار کیا بتاؤں، گاؤں میں انقلاب آگیا ہے۔

وہ کیسے، بھائی صاحب نے پوچھا، کانگرس کا تو ادھر نام و نشان بھی نہیں۔

چونی لعل نے بھائی صاحب کی طرف دیکھا، اور پھر مسکرا کر بولا۔ چھایا کو جانتے ہو نا، چھایا کو۔ اس کی بڑی لڑکی منکوال سے آج ہی آئی ہے۔

یہ سنتے ہی ہم تینوں اچھل پڑے، چونی لعل
کہنے لگا، بس کیا کہوں، نہایت ہی خوب صورت لڑکی ہے،
گو شادی شدہ ہے۔ مگر..... ....

میں اور چونی لعل بڑے بھائی کی طرف دیکھنے
لگے، اُن کی خوب صورت آنکھیں سیب کے پھولوں پر جمی
ہوئی تھیں، پھول نہایت خوش نما اور خوب صورت تھے
پھولوں کی پتیاں کہیں کہیں سرخ اور کہیں کہیں سفید تھیں،
شاید منکوال سے آئی ہوئی لڑکی کے گالوں کی طرح۔

بھائی صاحب نے دھیمی آواز میں کہا، پوری
کوشش کی جائے گی۔

چھایا اُن عورتوں میں سے تھی، جو بڑھاپے میں
بھی عالمِ شباب کی رعنائیوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں
اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی (سینہ کا ابھار کب کا
ختم ہو چکا تھا)، ٹھوڑی کے نیچے گوشت کچھ کچھ لٹک رہا تھا
آنکھوں کے گرد سلوٹیں پڑ چکی تھیں، اور چہرے کی جلد میں نہ
تناؤ رہا تھا، نہ جوانی کی حدت، لیکن اس کے باوجود اُسکی

چال میں ایک دلآویزی تھی، اب بھی جب وہ چلتی۔ تو مٹک مٹک کر، سر پر دوپٹہ ڈھلک جاتا، اور شانوں پر گر پڑتا اور کانوں کے قریب سفید بال دن کی روشنی میں زیادہ چمکنے لگتے۔ کمر کو جھٹک کر، لانبی گردن کو ایک طرف کر کے، جب وہ سڑک پر چلتی، تو گاؤں کے نوجوان اور بوڑھے، سب اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے، اور اکثر نوجوان اُس کا سرو قد دیکھ کر پیچھا کرتے، اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اُس کے پاس سے گزر جاتے، وہ کن آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھتی اور ململ کے دوپٹے سے چہرے کو ایک طرف سے ڈھانپ لیتی، اور کمر کو جھٹکاتی ہوئی آگے نکل جاتی، چھایا گاؤں میں عزت کی نگاہ سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ اس کا جرم صرف یہی تھا، کہ اس کا سہاگ جوانی میں لٹ چکا تھا، اور اب وہ مردوں سے پردہ نہ کرتی تھی اب اسے پردہ کس بات کا کرنا تھا، اس کا خاوند کب کا موت کی آغوش میں تھا، عین جوانی میں اس سے منہ موڑ چکا تھا۔ اب چھایا کے پاس کیا تھا، ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ——— کئی بوڑھوں نے للچائی ہوئی نظروں سے

اسے دیکھا، کئی منچلے نوجوانوں نے اپنی قسمت کو اس کے حوالے کرنا چاہا، لیکن چھایا نے سب سے یہی کہا کہ" اب وہ شادی نہیں کریگی"۔ گو گاؤں کے بڑے بڑے پنڈت، ساہوکار چھایا کی اس بغاوت کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے لیکن چھایا نے ان سماج کے ٹھیکہ داروں کی پروا نہ کی، اور اُس نے ایک شیرنی کی طرح اس ناسازگار حالات کا مقابلہ کیا، جب بڑی لڑکی جوان ہوئی تو اس کی شادی منگوال کردی، اور جب لڑکے کی عمر تیرہ سال ہوئی، تو چھایا نے لڑکے کو دوکان کھول دی، چھایا کا قصبے کے بڑے امیروں کے گھر آنا جانا تھا، وہ ان کے گھر جاتی، ان کا کام کرتی، انھیں باتیں سناتی اور اس طرح اسے "اونچے طبقے" میں کافی رسوخ حاصل ہوگیا تھا، وہ ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھی، اور اب تو اس کی بڑی لڑکی بھی اس کے ساتھ آتی تھی، اور اس طرح ہمیں اکثر چھایا کی لڑکی کو دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ پھر اچانک بڑے بھائی صاحب بیمار ہوگئے، اور یہ بیماری کیا تھی؟ یہ اختلاج قلب تھا، بعض ڈاکٹر تو اسے بیماری ہی نہیں سمجھتے، لیکن بڑے بھائی صاحب کو اس بیماری کی وجہ سے دورے پڑنے شروع

ہوئے، کئی کئی دفعہ ان کی نبض شدت سے تیز ہوجاتی، اور کبھی کبھی نہایت سست، منہ سے سفید جھاگ نکلنے لگتی، رنگ ہلدی کی طرح زرد ہوجاتا، اور ایسا معلوم ہوتا۔ کہ بس گئے؟ لیکن ان دوروں کا ایک اور بھی پہلو تھا، ان دوروں کے پڑنے سے اتنا ضرور ہوا۔ کہ چھایا کی لڑکی شانتی روزانہ بھائی صاحب کی خبرگیری کے لیے آیا کرتی، اور ان کے سرھانے کئی کئی گھنٹے بیٹھا کرتی۔ اور جب بھائی صاحب کا دورہ ٹھیک ہوجاتا، تو نہایت ہی محبت آمیز لہجے میں پوچھتی اب طبیعت کیسی ہے، کیا دل دھڑکتا ہے۔

جی ہاں، دھڑکتا ہے تو جیتا ہوں، ورنہ......

پھر شانتی کی شوخ نگاہیں مسکرائیں، اس کے سرخ لبوں پر اور سرخی آجاتی، اور داہنے رخسار پر نیلی سی رگ پھڑ پھڑاتی، اور میں دیر تک اس کانپتی ہوئی رگ کو دیکھتا رہتا، حتیٰ کہ میرا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا اور میں کمرے سے نکل کر باہر کھلی فضا میں آجاتا۔

میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ کہ بھائی صاحب کو دورے کم پڑنے لگے، شاید شانتی کی تیمارداری کا نتیجہ تھا

اور جب سے دورے پڑنے کم ہوئے شانتی نے بھی آنا کم کردیا، آج تقریباً ایک ماہ ہوچکا تھا۔ نہ بڑے بھائی صاحب کو دورہ پڑا تھا، شانتی بھی ایک ماہ سے نہیں آئی تھی، میں نے سوچا، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے بھائی صاحب سے پوچھا "ایک عرصہ سے شانتی آپ کی مزاج پرسی کرنے نہیں آئی"۔

"دورہ ہی نہیں پڑا۔ وہ بیچاری کیسے آتی اور وہ میری طرف دیکھنے لگے"۔

"کم از کم ایک ماہ میں ایک دورہ تو پڑنا چاہیے"۔ میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب میں اپنے آپ کو ٹھیک پاتا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب دورے نہیں پڑینگے"۔

لیکن — میرا مطلب — ہے — کہ — یعنی کہ شانتی ...... وہ میری طرف دیکھنے لگے، اور میں کچھ شرما سا گیا "اچھا کل مجھے دورہ پڑے گا۔ ذرا دھیان رکھنا۔"

ہوسکتا ہے، کہ بڑے بھائی کی زندگی میں ایسی

عورتیں کئی بار آئی ہوں، لیکن میری زندگی میں شانتی ایسی عورت نے پہلی بار قدم رکھا تھا۔ میری عمر ان دنوں بہت چھوٹی تھی۔ یہی کوئی سترہ یا اٹھارہ برس، جب شباب کی پہلی کرن پھوٹتی ہے، اور موسم بہار کی رنگینیوں اور لطافتوں سے پہلی بار انسان ہمکنار ہوتا ہے، جب یہ پھیلا ہوا نیلا آسمان یہ اونچے اونچے پہاڑ، یہ ندی کا صاف شفاف نرمل پانی، دھان کے پھیلے ہوئے کھیت، یہ بڑے بڑے پودے، یہ نرم و نازک گھاس کے خوشے، دل دماغ کو ایک نئی زندگی کا احساس کراتے ہیں۔ اس وقت انسان یہی محسوس کرتا ہے کہ آسمان ہمیشہ نیلا رہیگا، یہ درختوں کے پتے ہمیشہ سرسبز رہیں گے، اور اس ندی کا پانی کبھی گدلا نہ ہوگا۔ عورت کے ہونٹ ہمیشہ سرخ رہیں گے، اور اس سرسبز و شاداب وادی میں خزاں کبھی پاؤں نہ رکھے گی۔ اور میں اس جذبے کے زیر اثر شانتی کی طرف دیکھتا رہتا، لیکن اس دو ماہ کے عرصے میں کبھی کھل کر بات نہ کر سکا۔ اکثر میں اس کی موٹی موٹی، رسیلی آنکھوں کی طرف دیکھتا رہتا، جو شاید بھائی صاحب کے زرد چہرے پر جمی رہتیں اور جب کبھی وہ بیباکانہ انداز سے میری طرف دیکھتی، تو میرا

دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، اور میں اس کی طرف بالکل نہ دیکھ سکتا، لیکن اُس کے رنگین لبوں سے نکلی ہوئی باریک نسوانی آواز میرے جسم کے اندر ایک لطیف ارتعاش پیدا کر دیتی، اس کے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ، اور اس کے بالوں سے نکلی ہوئی ہلکی ہلکی خوشبو، مجھے بے چین کر دیتی، یہ باتیں ایک طوفان کی طرح میرا تعاقب کرتیں، اور میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آتا۔

دوسرے دن بستر سے اٹھتے ہی بھائی صاحب نے کہا، کہ اُن کی طبیعت ناساز ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ طبیعت خراب ہوتی گئی، پھر اچانک دورہ پڑ گیا، اور وہ چپ چاپ بستر پر دراز ہو گئے، سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ آج دورہ کچھ نرالا ہی تھا، نہ نبض سست تھی، نہ چہرہ زرد تھا لیکن بڑے بھائی صاحب نے اس چابکدستی سے اپنے چہرے کی ہیئت کو بگاڑا تھا، کہ گھر والوں کو یہ نیا دورہ نہایت خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ خیر دوائی دی گئی، اور بھائی صاحب کی حالت سدھرنے لگی، گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی، کہ آج تحصیلدار صاحب کے لڑکے کو پھر دورہ پڑا ہے، جیسا کہ امید تھی، شانتی بھائی صاحب کو دیکھنے کے لئے آئی، بھائی صاحب

بستر پر دراز تھے، شانتی چپکے سے آئی، اور بھائی صاحب کے سرھانے بیٹھ گئی، اُس کا چہرہ غم آلود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ کسی اہم بات کا انکشاف کرنے والی ہے، مگر آنکھوں میں وہی شوخی تھی، وہی چمک تھی، جو میں نے دو مہینے پہلے دیکھی تھی۔

شانتی تم کافی عرصے کے بعد آئی ہو۔

دورہ بھی مدت سے پڑا ہے نا۔

اور آج بھی دورہ اس لیے پڑا ہے کہ تمھیں ایک عرصہ ہوگیا تھا یہاں آئے ہوئے۔

شانتی خاموش رہی، اور شانتی کی سانتل کی شلوار، جس کا رنگ شفق کی طرح سرخ تھا، میری آنکھوں میں تیرنے لگا، اور اُس کے بالوں کی نرم، نازک، لطیف خوشبو میری طرف بڑھی

جانتی ہو شانتی۔ یہ کون ہے، انھوں نے میری طرف اشارہ کرکے کہا، اور کیا چاہتے ہیں۔

شانتی خاموش تھی۔

اب مجھے دورہ نہیں پڑے گا، بھائی صاحب

نے آہستہ سے کہا۔

اب میں بھی نہ آؤنگی۔

یہ کیوں۔

کل منگوال جا رہی ہوں شانتی نے نہایت دھیمی آواز میں یہ الفاظ کہے۔

اور میں دیر تک ان الفاظ پر غور کرتا رہا' اور کمرے سے باہر نکل آیا' میں شانتی سے کہنا چاہتا تھا۔ کہ وہ چند دنوں کے لیے ٹھہر جائے' تاکہ میں اس کی خوب صورت آنکھوں کو چند دن اور دیکھ سکوں اس کی مسکراہٹ سے چند دن اور لطف اندوز ہو سکوں' میں تو شانتی سے کچھ بھی نہ کہہ سکا کیا اسے معلوم ہے' کہ جب وہ میری طرف دیکھتی ہے' تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے' کیا اُسے معلوم ہے' کہ میں نے کئی بار اس سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن ہر بار کسی غیبی قوّت نے میرا گلہ دبوچ دیا۔ میں اپنے دل کا حال بھی بیان نہ کر سکا' کیا اسے معلوم ہے' کہ میں کتنی بار سیب کے درخت کے نیچے اُس کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔

کیا اُسے معلوم ہے، کہ کتنی بار میں نے اُسے سیب کے پھولوں کا گچھا دینا چاہا۔ لیکن ہر بار وہ میرے قریب سے گزر گئی، اور سیب کے پھول میرے ہاتھوں سے گر کر گھاس پر پڑے رہ گئے، اور میری بیچارگی پر قہقہہ لگانے رہے اور کل شانتی واپس منگوال جا رہی تھی۔ اب سورج غروب ہو رہا تھا، اور آسمان پر اڑتے ہوئے بادل معصوم بچوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، اُن کے گالوں پر شفق کی سرخی تھی۔ اور سرد ہوا اُن کے نرم گالوں کو چوم رہی تھی اب شانتی چلی جائے گی۔ میں اب اسے کبھی نہ دیکھ سکونگا میں اس کی مدھم شہد آگیں آواز کبھی نہ سن سکوں گا، میری نظر پھر ان ابھری ہوئی چوٹیوں پر پڑی، (جو شفق کی سرخی میں کسی جوان لڑکی کی چھاتیوں کی طرح ابھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں) ہوا کچھ اداس سی ہو چلی تھی، کچھ کچھ غمگین سی یکایک مجھے کسی باریک نسوانی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، تو شانتی کی بہن کملا کو اپنے سامنے پایا۔

"کیا بات ہے کملا"

بہن جی آپ کو بلاتی ہیں۔

کیا کام ہے۔
مجھے معلوم نہیں۔
میں تذبذب میں پڑ گیا۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، غروب آفتاب کے بعد یہ نئی روشنی کیسی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو شانتی کے گھر کے آنگن میں پایا۔ اندھیرا کافی بڑھ چکا تھا، اور آس پاس کے مکان اندھیرے میں معدوم ہوتے جا رہے تھے، یہ پہلی بار تھی، کہ میں شانتی کے ہاں گیا تھا، چھوٹا سا کچا گھر تھا، دو کمرے تھے، باہر دالان میں ایک چارپائی تھی، میں جاتے ہی چارپائی پر بیٹھ گیا، چھایا چولھے کے قریب بیٹھی ہوئی تھی، وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی، اور اس کا آنچل سر سے سرک گیا، اور اس کے کانوں کے قریب کے سفید بال اس دھیمی روشنی میں چاندی کے تاروں کی طرح چمکنے لگے۔ کہنے لگی "کچھ کھا پی لو بیٹا، کیا چائے تیار کروں۔

آپ جانتی ہیں، کہ میں چائے پیتا ہی نہیں۔
پھر کیا کھاؤ گے؟
کچھ نہیں، شانتی کدھر ہے۔

وہ پانی بھرنے گئی ہے ابھی آجائیگی۔ اتنا کہہ کر چھایا نے چولہے میں پھونکیں مارنا شروع کیں۔

اور پھر کسی کی آواز آئی' میں کل واپس منگوال جارہی تھی' میں نے سوچا۔ آج تم سے مل لوں' پھر شاید تم سے نہ مل سکوں' میں نے مڑکر دیکھا' تو شانتی چارپائی کے قریب کھڑی تھی' سر پر گھڑا تھا' سر کے بال کچھ بھیگ چکے تھے' اور پانی کے چند قطرے پیشانی کو چومتے ہوئے رخساروں پر ڈھلک رہے تھے' میں نے نظریں نیچی کرلیں' اور زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ دراصل میں چھایا سے ڈر رہا تھا۔ اور ساتھ ہی شانتی کے بیباک لہجے نے مجھے بالکل گونگا بنا دیا۔

"آنند کہاں ہے؟"

"وہ شام کوٹ گیا ہے' وہاں ایک رشتہ دار کی شادی تھی۔" چھایا نے کہا۔

تم کب جارہے ہو' میں نے سنا ہے' کہ بڑے صاحب یہاں ٹھہریں گے' اور تم جلد چلے جاؤگے' شانتی نے دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"گرمیوں کی چھٹیاں تقریباً ختم ہی ہیں' شاید

انترسوں چلا جاؤں، اور کیا کل تم ضرور جا رہی ہو۔

"ہاں کل ضرور جاؤنگی۔"

"اتنی جلدی کیا ہے۔ ایک دو دن ٹھہر جاؤ۔ پھر اکھٹے چلیں گے۔"

نہیں نہیں۔ اسے کل ضرور جانا ہے، اسے شادی میں خاص طور پر بلایا گیا ہے۔ اور شادی بھی قریبی رشتہ دار کی ہے، اور اگر کل نہ گئی۔ تو وقت پر نہ پہنچ سکیگی، چھایا نے میری طرف دیکھتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

شانتی سامنے چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی، میرے اور اس کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ تھا، میں چاہتا تھا کہ میں جلد از جلد اس فاصلہ کو پھلانگ لوں، اور شانتی کے ساتھ جا بیٹھوں، لیکن چھایا کی موجودگی نے ذہن پر ایک بوجھ ڈالا ہوا تھا، اور اگر چھایا موجود نہ ہوتی، تب بھی میرے لیے یہ ناممکن تھا، کہ میں شانتی کے قریب جا بیٹھتا۔ اُس کی ساٹن کی شلوار کو چھوکر دیکھتا۔ اس کے نازک، نرم، ملائم ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتا۔ اس کے مسکراتے ہوئے لبوں پر (اپنے لب رکھتا، اس کے رخساروں پر چمکتی ہوئی آنکھوں

پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا) لیکن اتنی ہمت نہ تھی' اتنی سکت نہ تھی' شرم' ڈر' جھجھک نے بے دست و پا کر دیا تھا' اور پھر میں نہیں جانتا' کہ ایسا کیوں ہوا۔ کہ چھایا اندر چلی گئی' اور شانتی اپنی چارپائی سے اٹھ کر میرے قریب بیٹھ گئی' میں کچھ گھبرا سا گیا' لیکن شانتی کی بیباک ہنسی نے میرے کانپتے ہوئے دل کو تقویت دی' اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شانتی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا' کتنا نرم اور گداز تھا' شاید' ریشم کے تاروں سے زیادہ نرم' نازک' سیب کے پھولوں سے مرمریں اور سپید ——— میں اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا' آنکھیں مسکرا رہی تھیں' میں اس کے رخساروں کی طرف دیکھنے لگا' وہ گلاب کی طرح سرخ تھے' میں اس کے لبوں کے کونوں کی طرف دیکھنے لگا' رخساروں سے ڈھلک کر پانی کے قطرے کونوں کے قریب آ چکے تھے' ان قطروں میں کتنی پاکیزگی تھی' ان لبوں میں کتنی آگ ہوگی' پھر میری نگاہ ٹھوڑی سے ہوتی ہوئی سینے کی طرف بڑھی (میں نے سینے کو چھونا چاہا۔ لیکن ہاتھ رک گئے)' اور پھر میں نے دیکھا کہ شانتی خود بخود میری طرف جھکی' شاید وہ میری بے بسی کا

اندازہ کر چکی تھی، اس کی نازک انگلیوں نے میرے گالوں کو چھوا اور اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا (میں نے اپنا ہاتھ اُس کے سینے پر رکھا) اُس کا دل تیزی سے حرکت کر رہا تھا، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نازک، ملائم، پرندہ میرے ہاتھوں میں پھڑپھڑا رہا ہے، اور وہ قید سے آزاد ہونا چاہتا ہے، میں نے اپنے آپ کو شانتی کے آتشیں جسم کے حوالے کر دیا، اس نے آہستہ سے میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے، میں شانتی کے ہونٹوں کے دباؤ کو محسوس کر رہا تھا، آہستہ آہستہ یہ دباؤ، میرے ہونٹوں سے پھیلتا ہوا میرے ذہن، میرے دل، میرے جسم کے گوشے گوشے میں سما گیا، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، مجھے اُس وقت کسی چیز کی موجودگی کا احساس نہ رہا، بلکہ میں اپنی ہستی سے بھی بے بہرہ ہو گیا، صرف کسی کے ہونٹوں کے دباؤ کو محسوس کر رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ میں زندگی کی ایک نئی دہلیز پر کھڑا ہوں، مجھے وقت کا احساس ہے نہ زندگی کا نہ موت کا، جہاں نہ مجھے اپنی ہستی کا علم ہے، اور نہ میں شانتی کے وجود کا احساس کر سکتا ہوں، صرف ایک تصویر، غیر واضح، لا یتہ، مبہم، چھینتا ہوا،

دباؤ، جو ہونٹوں سے ہوتا ہوا، جسم کے گوشے گوشے میں پھیل رہا تھا......... اور پھر کسی کی آواز آئی۔ اور شانتی فوراً مجھ سے علیحدہ ہوگئی، اور دوسری چارپائی پر جا بیٹھی۔ میں چھایا کو سامنے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے چوری کرتے کرتے پکڑا گیا ہوں، میں جلدی اٹھ بیٹھا، اور کچھ کہے سنے بغیر شانتی کے گھر سے باہر نکل آیا، باہر گھپ اندھیرا تھا، صرف ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے، جو میرے تپتے ہوئے گالوں سے ہمکنار ہوئے تو مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی۔ جب گھر پہنچا تو دماغ کی عجیب کیفیت تھی، طرح طرح کے خیالات دماغ میں رینگ رہے تھے، شانتی نے مجھے کیوں بلایا؟ کیا چھایا نے تمام واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اگر اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تو کیوں کیا ——— ان باتوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

دوسرے دن شانتی چلی گئی، گرمیوں کی چھٹیاں بھی ختم ہوگئیں اور میں لاہور چلا آیا۔ میں نے شانتی کو بھلانے کی کوشش بھی کی، لیکن بھلا نہ سکا، کبھی خیال آتا، چلو منگوال

چلیں، کیونکہ شانتی نے اس الوداعی صبح کو کہا تھا۔ کہ کبھی منگوال آنا، لیکن پھر خیال آتا، کہ کیا کروگے جاکر۔ اب شانتی وہاں اکیلی نہ ہوگی، وہاں اُس کا خاوند ہوگا۔ اور اگر اس کا خاوند پوچھ لے، کہ تم شانتی کے کیا لگتے ہو، شانتی سے کیوں ملنے آئے ہو، تو تم کیا جواب دوگے۔ پھر خیال آتا، چلو، ایک خط ہی ڈال دیں، لیکن خط لکھ کر کیا کروگے، ان باتوں کو چھوڑ دو، ان باتوں سے کیا ہوگا۔ لیکن یہ باتیں بھولتی نہیں، زندہ رہتی ہیں، مرتی نہیں، میں نے ہر بار یہی کوشش کی، کہ اپنے آپ کو لاہور کی تمام رنگینیوں میں مدغم کردوں، لیکن یہ کوششیں کارگر ثابت نہ ہوئیں، مال روڈ کی سیریں، لارنس کی گشت، رنگ برنگ کی ساڑھیاں، سب شانتی کی یاد کو دل سے نہ مٹا سکیں۔ کیا شانتی مجھے بھول گئی ہوگی، کیا اُس بوسہ کا ابدی نشہ کبھی زائل ہوسکتا ہے۔ کیا اُس بوسے کی لازوال مسرت کبھی فنا ہوسکتی ہے، میں اب اُس ان جانے، لاپتہ، غیر واضح، مبہم، دباؤ کو اپنے ہونٹوں پر محسوس کرسکتا ہوں، اُس بوسے میں کتنی گرمائی تھی، اُس بوسے میں کتنا خلوص تھا، کتنا ایثار تھا، جیسے شانتی نے زندگی کی تمام قیود سے آزاد ہوکر مجھے چوما تھا، جیسے اُس وقت اُس کی شادی

نہ ہوئی تھی، اور اُس کے لب ایک کنواری، معصوم، انجان الھڑ لڑکی کے لب تھے، اب کے میں پھر سلگام گیا۔لیکن شانتی نہ آئی اب محبت کا قصہ پرانا ہوچکا تھا، اُس میں وہ شدت نہ تھی، وہ تپش نہ تھی، اب اذیت ناک درد کے جھٹکے نہ تھے، میں اپنے دوستوں کو اپنی محبت کا قصہ بڑے طمطراق سے سناتا۔کہ کس طرح ایک لڑکی نے مجھے زندگی میں پہلی بار چوما۔اور اُس بوسۂ طویل کا ذکر نہایت چٹخارے لیکر اپنے کنوارے دوستوں کو سناتا میرے دوست نہایت انہماک سے اس داستان کو سنتے اور کئی دوست، شانتی کو گالیاں بھی دیتے، اور کہتے ہندوستان کی تہذیب وتمدن میں ایسی لڑکی کے لئے کوئی جگہ نہیں، اور میں ہندوستان کے سعادت مند بیٹوں کی طرف دیکھتا، اور چپ ہوجاتا، میں ان کی نگاہوں کی جنسی بھوک کو دیکھ سکتا تھا، میں جانتا تھا کہ کس طرح میرے دوست، سڑک پہ آوارہ بھٹکتی ہوئی غریب بھکارنوں کو چند ٹکے دے کر اپنی مفلوج شدہ روح کو چند ثانیوں کے لیے تسکین دیتے تھے لیکن مجھے کیا اور شانتی کی یاد روح کے ایک گوشہ میں کلبلاتی تھی، اور اب بھی جی چاہتا تھا، کہ ایک بار پھر شانتی کو دیکھ لوں، اب کے میں نے تہیہ کرلیا، کہ اگر

شانتی سلکام نہ آئی، تو میں منکوال اُسے ملنے ضرور جاؤں گا،
گرمیوں کی چھٹیاں آئیں اور ختم ہوگئیں، اور شانتی نہ آئی اور
اس دفعہ تو والد صاحب کی تبدیلی بھی ہوگئی، اور انھیں سلکام
چھوڑ کر امرکوٹ جانا پڑا۔ امرکوٹ سلکام سے ۲۵ میل کے فاصلے
پر ہے، اور درمیانی راستہ گھوڑوں پر طے کرنا پڑتا ہے، رہی سہی
امیدیں بھی خاک میں مل گئیں، اب جب میں گرمیوں کی چھٹیوں
میں امرکوٹ آیا، تو امرکوٹ میں خوب ملیریا پڑا۔ کتنے ہی آدمی
اس موذی مرض کا شکار ہوئے، اور جو بچ رہے۔ وہ اتنے کمزور
اور نحیف ہو گئے تھے، کہ موت کا نظارہ زندگی میں دیکھ رہے تھے،
لوگوں نے خدا کی منتیں کیں، چڑھاوے چڑھائے۔ کئی بار ہون
کیے، خدا سے دعا کی، لیکن امرکوٹ کا خدا ہی نرالا تھا، (اس نے
لوگوں کی متحدہ آواز کو ٹھکرا دیا) لوگ کہتے تھے، یہ مچھر نہیں
سانپ ہیں، جو اپنا زہر جسم کے اندر سرایت کر دیتے ہیں، اور
پھر انسان کا بچنا محال ہوجاتا ہے۔ ہر طرف بے کسی، بے بسی
یاس و حرماں، موت، بیماری، زرد چہرے، اور کونین کی گولیاں
دکھائی دیتی تھیں، مجھے بھی ایک دو بار بخار آیا، پہلے ہی کافی
کمزور تھا، رہی سہی صحت ملیریا کے نذر ہوئی، اور پھر معلوم ہوا

کہ شانتی سلکام آئی ہوئی ہے، چند دنوں کے بعد میں سلکام چلا گیا میں دو دن تک شانتی کے گھر نہ گیا، میں نے سوچا، شانتی خود مجھ سے ملنے آئے گی۔ لیکن جب شانتی مجھ سے ملنے نہ آئی تو میں خود اُن کے گھر چلا گیا۔ جب برآمدے میں داخل ہوا تو سامنے کملا کو پایا۔

"بھراتا جی نمستے۔" کملا نے شرماتے ہوئے کہا۔

کملا اب کافی جوان ہو چکی تھی، میں تین سال کے بعد سلکام آیا تھا۔ کملا کی شکل و صورت بالکل شانتی سے ملتی تھی، ہاں، وہی لب، وہی ٹھوڑی، وہی ناک، وہی لبوں پہ ناچتی ہوئی مسکراہٹ۔

"اوہ۔ اب تو تم خاصی لمبی ہو گئی ہو، شانتی کدھر ہے، آنند کہاں ہے۔"

"آنند دوکان پر ہے، اور شانتی ابھی آتی ہی ہو گی۔" آواز میں حلاوت تھی، مٹھاس تھی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد شانتی بھی آ گئی، اُس نے مجھے دیکھا تو ہنس پڑی۔

"بہت مدت کے بعد آئے ہو۔ کہو طبیعت تو

ٹھیک ہے نا۔

میں نے شانتی کے چہرے پر نظریں گاڑدیں چہرہ اب جاذب نظر نہ تھا، کنول جیسی آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں چہرہ پر چھائیاں پڑ چکی تھیں، وہ پہلے سے زیادہ موٹی اور بھاری ہوگئی تھی، چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا، آنکھوں میں شوخی تھی نہ شرارت، اور اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔

"چائے پیو گے"

میں نے نفی میں جواب دیا۔

میرا جواب سن کر اُس کا رنگ اور زرد ہوگیا، اور دوپٹے سے پیٹ کو ڈھانپتے ہوئے اُس نے لبوں پر ایک بے جان، بے کیف ہنسی کو لانا چاہا۔ لیکن کوشش سے مسکراہٹ میں زندگی نہیں آتی۔

"اب تم کب ہمارے گھر کی چائے پیو گے، اچھا رات کو یہیں روٹی کھانا"

"لیکن تم اتنی کمزور کیوں ہوگئی ہو، کیا تمھیں اپنی صحت کی کوئی پرواہ نہیں، تمھارے چہرے کا رنگ بھی زرد ہوگیا ہے"

ڈاکٹر کو دکھایا تھا، ڈاکٹر کہتا ہے ' خون کی
کمی ہے، خوراک اچھی کھانی چاہیئے ، اور کسی قسم کی فکر نہیں
کرنا چاہیئے۔ کل اُن کا خط آیا تھا' (خط میری طرف پھینک کے)
لکھتے ہیں، جلد چلی آؤ ' یہاں بہت سے ڈاکٹر مل سکتے ہیں
نرسیں بھی ہیں، اور دوائی بھی اچھی ملیگی۔"

" تو کب واپس جاؤ گی۔"

میں جلد ہی چلی جاتی ، لیکن ماتاجی کہتی ہیں'
کہ تین سال کے بعد آئی ہو' ایک دو ماہ اور ٹھہر جاؤ۔

اتنے میں چھایا بھی آگئی ' اُس کے سر سے
پھر دوپٹہ ڈھلک گیا ' اور چھایا نے گردن کو ایک طرف
جھٹک دیا' کہنے لگی۔ کتنے دن ہوئے آئے ہوئے کہاں
ٹھہرے ہو' سیدھے یہاں ہی کیوں نہیں چلے آئے' تم میں
اب وہ چاہ ہی نہیں رہی۔

" چھوڑو ماں جی ' انھیں' اب یہ بہت بڑے
آدمی ہیں' انھیں اب کس کی پرواہ ہے۔"

اور میں نے اٹھنا چاہا ' لیکن شانتی کی آنکھیں
بار بار کچھ کہہ رہی تھیں ' اُن آنکھوں میں جوانی کی شکست

کا اعتراف تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں بیٹھ تو جاؤ۔ اب تم جا رہے ہو، اور شاید ہمیشہ کے لیے لیکن میری باتیں تو سنتے جاؤ۔ مانا۔ کہ تم پہلے سے زیادہ سمجھدار اور بیباک ہو گئے ہو، تمھاری آنکھوں میں وہ معصومیت نہیں، جو پہلے تھی۔

اب تمھارا سینہ زیادہ چوڑا ہو گیا ہے، اب تم پہلے سے زیادہ لمبے ہو گئے ہو، اور میں زیادہ بدصورت ہو گئی ہوں، اب تم نے ایک ایکٹر کی طرح مونچھیں بھی رکھ لی ہیں، خیر۔ ایک بار منگوال تو آتے، تو میری دلی مراد تو پوری ہو جاتی، میں اس لیے تمھیں منگوال بلانا چاہتی تھی، تاکہ تم بھی کچھ عرصے کے لیے اس ماحول سے دوچار ہوتے، جہاں میں رہتی تھی، کم از کم تم میرے خاوند کو دیکھ لیتے، تو تمھیں معلوم ہو جاتا۔ کہ میں نے کیوں اس ماحول سے بغاوت کی، میری ماں نے اگر میری شادی ایک امیر بیوپاری سے کر دی، تو اُس میں میری ہی بھلائی دیکھی تھی، وہ سمجھتی تھی۔ کہ امیر گھرانے میں کم از کم کھانے پینے کو کافی مل جاتا ہے، اور ہوا بھی ایسا ہی، کھانے کو کافی

ملا۔ طرح طرح کے کپڑے پہننے کو ملے، زیورات سے صندوق بھرے ہوئے تھے، لیکن خاوند ایسا ملا، جسے دیکھتے ہی مجھے نفرت ہوگئی، ایک مدقوق دبلا پتلا سا انسان، عمر میں باپ کے برابر۔ برتاؤ میں اتنی ملائمت اور شیرینی، کہ باتیں سن کر جی اکتا جائے، مجھے باپ جیسا برتاؤ اچھا نہیں لگتا، میں چاہتی تھی کہ مجھے کوئی ستائے، کوئی چھیڑے، کوئی ہنسائے، کوئی رلائے، مگر منا بھی لے، لیکن یہاں تو زندگی ایک ہی راستے پر گامزن تھی، ایک ہی سوال اور اور ایک ہی جواب، جی اکتا گیا تھا۔ اس زندگی سے زندگی میں لطافت تھی، نہ مسرت، اور اگر ان حالات میں میں نے تمہارے ہونٹ چوم لیے، تو مجھے کہیں دستوں کے بیچ طوائف نہ کہہ دینا، اور اگر میری ماں نے یہ ماجرا دیکھ کر تمہیں کچھ نہ کہا، تو تمہیں اس کی عقلمندی کی داد دینی چاہیئے۔ اس نے بیوہ رہ کر جنسی بھوک کی خوفناک صورتوں کو محسوس کرلیا تھا۔ وہ جانتی تھی، کہ اس نے اپنی لڑکی کو ایک ایسے شخص کے حوالے کیا ہے، جو اس کی لڑکی کو کبھی مسرت عطا نہیں کرسکتا۔ اور اگر چند لمحوں

کے لیے اُس کی لڑکی خوشی کے لازوال لمحوں سے ہم کنار ہو سکتی ہے، تو اس میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کو کوئی بٹہ نہیں لگتا، اور پرماتما کے لیئے میری محبت کا ڈھنڈورا دوستوں میں نہ پیٹنا۔ سچ کہتی ہوں، جس شانتی نے تمہارے لب چومے، وہ کب کی مر چکی، اُس کی روح کب کی فنا ہو چکی، اُس کے مرنے کے نقوش کب سے خلط ملط ہو چکے، اب میری طرف کیوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو، کیا حقیقت کے چند الفاظ پسند نہیں آئے کیا ان لفظوں میں بہت تلخی ہے، شاید۔ ہو، لیکن میری طرف تو دیکھو، کہ اس خوفناک، تلخی نے میرے ساتھ کس طرح بدلہ لیا ہے، اور.........

پھر چھایا بولی۔ آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔ کل چلے جانا۔

لیکن میں وہاں نہ ٹھہر سکا، اور دوسرے دن امرکوٹ چلا گیا۔ اور چند دنوں کے بعد مجھے اطلاع ملی، کہ شانتی کے ہاں ایک مردہ بچہ پیدا ہوا۔ اور دوسرے دن شانتی اِس دنیا سے کوچ کر گئی، میں فوراً ہی ڈرائنگ روم

میں گیا۔

بڑے بھائی صاحب اخبار پڑھ رہے تھے۔

"کیا آپ کو معلوم ہے۔ کہ شانتی مرگئی"

اُسے کیا ہوا۔ بھائی صاحب نے چونک کرکہا۔

"مردہ بچہ پیدا ہوا۔ شاید زہر اثر کر گیا۔

میں نے بڑے بھائی صاحب کی طرف دیکھا

اُن کی نگاہیں زمین پر جھکی ہوئی تھیں۔



شادی کے بعد

عورت ۔ (بستر پر کروٹ لیتے ہوئے)
نیند نہیں آتی ۔

مرد ۔ (ٹانگوں کو پھیلا کر) میرا بھی یہی حال ہے ۔ اس کمرے میں تو دم گھٹا جارہا ہے، کل سے تم اپنی چارپائی ساتھ والے کمرے میں رکھا کرو ۔

عورت ۔ کھڑکی کھول دو، ہوا کتنی گرم ہے، سانس لینا دوبھر ہوگیا ہے ۔

مرد ۔ ہماری شادی کب ہوئی تھی ۔ کتنا عرصہ ہوا ہے ہماری شادی ہوئے ۔ کیا تمھیں یاد ہے ۔

عورت ۔ صرف چھ مہینے

مرد - اچھا یہ کھڑکی کھول دو، جس سے دم گھٹا جا رہا ہے -

عورت - تم کیوں نہیں کھولتے -

مرد - عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کا حکم مانے -

عورت - چھ مہینوں سے برابر تمھارا حکم مان رہی ہوں، آج تم میرا کہنا مان لو -

مرد - اب تم ضرورت سے زیادہ باتیں کرتی ہو -

عورت - اب تم ضرورت سے زیادہ حکم کرتے ہو -

مرد - مرد ہمیشہ عورت پر حکومت کرتا آیا ہے -

عورت - پرانی باتیں کب کی ختم ہو گئی ہیں، اب نیا زمانہ ہے -

مرد - لیکن اس دوران میں نہ عورت بدلی ہے اور نہ ہی مرد - اگر زمانہ بدل گیا ہے، تو کیا ہوا -

عورت - زمانے کے ساتھ مرد کو بھی بدلنا چاہیے -

مرد - اچھا خاموش ہو جاؤ، کیوں چلا رہی

ہے ـــــ تمھارا چلانا مجھے اچھا نہیں لگتا، سچ پوچھو۔ تو مجھے تم سے نفرت ہوگئی ہے، اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمھیں کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔

عورت۔ (جوش میں آکر) بڑے آئے باہر پھینکنے والے، وہ دن بھول گئے جب میرے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے، میں بات تک نہ کرتی تھی، اور تم میرے مکان کے گرد تین تین، چکر لگایا کرتے تھے۔

مرد۔ (بات کاٹ کر) اوہ۔ ناراض ہوگئیں ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ حرف بحرف سچ ہے۔

عورت۔ (بلند آواز میں کہتی ہے) میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

مرد۔ میں جانتا ہوں۔

عورت۔ اگر جانتے ہو، تو پھر میرا مغز کیوں چاٹ رہے ہو۔

مرد۔ میں چاہتا تھا۔ کہ اس طرح نہ ہوتا، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوگیا۔ میں تم سے

کیوں نفرت کرتا ہوں، ابھی چند مہینے ہوئے تھے، تم سے لازوال محبت تھی۔ ہاں مجھے وہ دن یاد ہے، جب تم مجھے انارکلی کے نکڑ پر ملی تھیں، تمھارے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ تم نے سفید رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ بادلوں کا سفید ٹکڑا تمھارے ارد گرد لپیٹ دیا گیا ہو، اور تمھارے کانوں میں لٹکتے ہوئے آویزے، دو ستاروں کی طرح جھانک رہے تھے، میں جان بوجھ کر تمھارے قریب سے گزرا تھا۔ میں نے ہائے کا نعرہ نہایت دھیمی آواز میں لگایا تھا۔

عورت۔ تم اُس وقت بالکل لوفر لگتے تھے۔

مرد۔ گالی نہ دو جی۔

عورت۔ ہاں بکے جاؤ۔

مرد۔ اور تمھاری آنکھوں میں کونسی جنت تھی، جس نے مجھے پاگل کر دیا۔ تمھاری آنکھوں میں کونسی برق تھی۔ جس نے مجھے بے دست و پا کر دیا۔ لیکن۔ ہاں اُس وقت میں واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ کاش ایسا کبھی نہ ہوتا۔ اور وہ تمھاری سیاہ فام سہیلی، جسے اپنی لپ لٹک پر

ناز تھا۔ کہنے لگی، بات کرنے کی تمیز نہیں، لفنگا کہیں کا، اور وہ آگے بڑھ گئی، اور تم میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

عورت۔ رہنے بھی دو۔ کیا آپ کو اپنی شکل و صورت پر بہت ناز ہے، تمھارے جیسے کئی لڑکے میرے آگے پیچھے پھرتے تھے۔

مرد۔ تو کس نے کہا تھا۔ کہ مجھ سے شادی کرلو۔ کسی اور سے شادی کرلی ہوتی، میں نے نائی یا پنڈت تو نہیں بھیجا تھا۔ جو اب رعب جمانے چلی ہو، تمھاری ماں کئی بار ہمارے گھر آئیں، اُس نے منتیں کیں، اپنی لڑکی کے حق میں قصیدے پڑھے، تعریفوں کے پل باندھے، تب جاکر کہیں شادی ہوئی تھی۔

عورت۔ جی، خوب سمجھی۔ اور اپنی کارستانیاں بھول گئے۔ ہر روز نوکر کے ہاتھ خط بھیج دیتے تھے، خطوں میں لکھا ہوتا تھا۔ کہ میں تم پر مرتا ہوں۔ اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی، تو میں زہر کھاکر مرجاؤں گا۔ کاش تم نے زہر کھالیا ہوتا۔!

مرد۔ وہ تو محض مذاق تھا۔

عورت۔ تو اب رونے سے کیا فائدہ؟

مرد۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر شادی سے پہلے میں تمہارے اطوار سے واقف ہو جاتا۔ شادی سے پہلے میں سمجھتا تھا۔ کہ تم ایک دیوی ہو، تم ایک فرمانبردار بیوی کی طرح میرا حکم مانو گی، گھر کا کام کرو گی، میری اندھیری زندگی میں اُجالا کرو گی، لیکن یہاں تو ——

عورت۔ میں سمجھتی تھی۔ کہ شادی کے بعد نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ وہ سنہری سپنے کہاں گئے، میں جو کچھ دیکھا کرتی تھی، وہ قوسِ قزح کدھر گئی، جو میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت ناچتی رہتی تھی۔ میں سمجھتی تھی، میں جو کچھ کہوں گی، وہی ہوگا۔ گھر میں کام کرتے کرتے تھک گئی تھی، ماں کی گھرکیاں سن کر جی اُکتا گیا تھا۔ اور جب تم کبھی مجھے نظر آجاتے تھے، تو میرے جسم میں بھی لہر دوڑ جاتی تھی، ہاں خوشی کی لہر، اَن گنت خوشیوں کی لہریں۔ لیکن شادی کے بعد کیا ہوا۔ کہ پہلا سکون بھی گیا۔ وہ سپنے ٹوٹ گئے، وہ قوسِ قزح غائب ہو گئی۔ پھر وہی کام۔ وہی گندے برتن صاف کرو، روٹی پکاؤ، آگ جلاؤ، کمرے صاف کرو، فرش دھوؤ، میلے کپڑوں کو صاف کرو، نہ گھر میں نوکر،

نہ جاکر۔ جب خاوند گھر آئے۔ تو غریب مسکین عورت کی طرح اُس کی خوشامد کرو، اُسے روٹی کھلاؤ، اور جو بچ جائے، وہ خود کھاؤ اور پھر تھکے ہوئے خاوند کی ٹانگیں دباؤ، سر میں درد ہو، تو تیل کی مالش کرو، پیٹ میں درد ہو، تو امرت دھارا پلاؤ۔ کیا انہی مصیبتوں کا نام شادی ہے، پرماتما بچائے ایسی شادی سے۔

مرد۔ (اَن سُنی کرکے) شادی سے پہلے تم کتنی حسین دکھائی دیتی تھیں۔ شملہ کی وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتا، سورج کی الوداعی کرنیں، شملہ کی سرسبز پہاڑیوں کو چوم کر شام کی تاریکی میں جذب ہوگئیں، رات کے سائے گہرے بڑھتے گئے۔ اور سڑکوں پر بجلی کے قمقمے جگمگ جگمگ کرنے لگے، ہوا ٹھنڈی اور سرد تھی، تم دو تین لڑکیوں کے ساتھ شملہ کی مال روڈ پر خراماں خراماں سیر کررہی تھیں، تم نے اورکوٹ پہن رکھا تھا، اور میں تمہارا تعاقب کررہا تھا۔ تم کبھی کبھی مڑکر مجھے دیکھ لیتی تھیں، اور میں تمہاری اس حرکت کو کتنا عزیز سمجھتا تھا۔ اُس وقت ——

مرد۔ کبھی میں تمہارے قریب سے گزر کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ تو تم مسکرا دیتی تھیں، وہ مسکراہٹ کتنی فرحت ناک ہوتی تھی۔ اُس مسکراہٹ کا میں اُس وقت تجزیہ نہ کرسکتا تھا

پہلے کیا معلوم تھا، کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے ایک چڑ چڑی بدمزاج، بددماغ لڑکی چھپی ہوئی ہے، اور میں اکثر تمہارے متعلق رات بھر سوچتا رہتا تھا۔ اُس رات کئی بار تم میری آغوش میں آئیں، کئی بار میں نے تمہارے لبوں کی مسکراہٹ کو اپنی مسکراہٹ سے چوما، کئی بار میں نے تمہاری نیند سے بوجھل آنکھوں پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دئیے، کئی بار میں نے تمہارے سیاہ بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں، اور رات بھر سرگوشیانہ انداز میں تم سے باتیں کرتا رہا۔ اپنے متعلق، تمہارے متعلق، آنے والی زندگی کے متعلق، شملہ کی ٹھنڈی یخ بستہ راتوں کے متعلق، تمہاری سہیلیوں کے متعلق، اور پھر تم میری آغوش میں سو گئیں، اور جب میں جاگا، تو تمہارے چہرے کی رعنائی اڑ چکی تھی، تمہارے بالوں کی چمک غائب ہو چکی تھی، تمہارے لب خشک اور باسی ہو گئے تھے، تمہاری تمام خوبیاں فنا ہو گئی تھیں، اور تم مجھے ایک بدصورت، بیوقوف عورت نظر آنے لگیں۔

عورت۔ اب میں بدصورت ہو گئی، لیکن تم کیا ہو، یہ بھی جانتے ہو، تمہارے ماں باپ نے ہمیں کس طرح

پھانسا - تمھارے والدین کہتے تھے - لڑکا بڑا ذہین ہے - پڑھا لکھا ہے' بی - اے پاس ہے' (پھر ہنس کر کہتی ہے) شاید تم ہی تمام ہندوستان بھر میں واحد گریجویٹ ہو' بی - اے کی ڈگری لے کر پرماتما جانے' تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو' تمھارے والدین کہتے تھے - لڑکا گورنمنٹ کی نوکری کرتا ہے' جیسے باقی تو جھک مارتے ہیں' مستقل جگہ ہے' جلدی ترقی مل جائے گی' اب سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے' تین مہینوں کے بعد ایک سو پچاس روپیہ ہو جائے گی اور اب شادی کے بعد عقدہ کھلا - کہ آپ کی کتنی تنخواہ ہے' واہ رے آپ کی گورنمنٹ سروس' —— میں کہتی ہوں اگر آج لڑائی ختم ہو جائے' تو کل ہی آپ کو اس نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں' عارضی نوکری' گری ہوئی کلرکی' تین روپیہ سالانہ ترقی' اور جس پر آپ اتنا اتراتے ہیں' اور اپنے آپ کو بابو کہتے ہیں اگر مجھے معلوم ہوتا - کہ شادی کے بعد محبت فنا ہو جاتی ہے' تو کبھی آپ سے شادی نہ کرتی -

مرد - بھلا تم کتنا بڑا جہیز لائی تھیں - تمھارے والدین نے کونسی جائداد میرے نام کر دی ہے' اور کون سے الاؤنس میرے نام بھیجے جاتے ہیں - جو منھ پھاڑ پھاڑ کر میری

توہین کر رہی ہو، برات گئی۔ تو پانی تک کو نہیں پوچھا، کہہ دیا۔کہ ہمارے ہاں رواج نہیں ہے، اچھا رواج ہے۔ برات آپ کے گھر جائے، اور گرمیوں کی کڑکتی ہوئی دھوپ میں۔لیکن آپ پانی تک نہ پلائیں، کیا خوب طریقہ ہے، پیسے جمع کرنے کا، صرف دس گیارہ ساڑھیاں لے آئی ہو اور اس پر اتراتی ہو اور لوگوں سے کہتی پھرتی ہو۔جی ہماری کوٹھیاں ہیں۔ ہم نے گھر میں کبھی کام بھی نہیں کیا، گھر میں دو نوکر ہیں، میں نے آپ کے گھر ایک نوکر بھی نہیں دیکھا، میں جانتا ہوں یہ سب حیلہ سازیاں ہیں ان جھانسوں میں آنے والا نہیں، اور ــــــ

عورت۔ اور۔ اور۔ کیا۔ جب سے یہاں آئی ہوں، آپ نے کون سے سوٹ سلا کر دئے ہیں، جہیز کے کپڑے تو پہن رہی ہوں، کبھی بھی آپ نے پوچھا۔کہ گھر کے کام کاج کا کیا حال ہے، صبح سے لے کر شام تک گھر کا کام کاج کرتی ہوں صرف آپ کا ہی نہیں، آپ کے والدین کا بھی، آپ کے بھائی کا بھی، یہ بھی کوئی زندگی ہے، کئی بار یہ کہہ چکی ہوں، میں علیحدہ رہنا چاہتی ہوں۔ میری آپ کے والدین سے نہیں بنتی، لیکن آپ میری بات سنتے ہی نہیں، صبح روٹی کھا کر گئے، اور

شام کے سات بجے واپس آگئے، جیسے ساری گورنمنٹ کا انحصار آپ پر ہی ہے، اگر آپ دفتر نہ جائیں، تو کیا گورنمنٹ آف انڈیا کا کام بند ہو جائے گا۔

مرد۔ کیا نام تھا اُن کا جو ہر روز ہمارے گھر آتے تھے، ہاں یاد آیا۔ لالہ گنیش داس۔ جو آپ کی تعریف کرتے کرتے مرے جاتے تھے۔ کہتے تھے لڑکی کیا ہے، ہیرا ہے ہیرا۔ گھر کا کام کاج نہایت تن دہی سے کرتی ہے، سینا پرونا جانتی ہے، کھانا اتنا اچھا تیار کر سکتی ہے۔ کہ بڑے بڑے بٹلروں کو مات کردے، اجی ایک وقت میں دس آدمیوں کا کھانا تیار کر سکتی ہے، جیسے میں رائل ہوٹل کھولنا چاہتا ہوں۔ آپ سگائی تو کر کے دیکھیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ لڑکیاں کیا ہوتی ہیں، ساس سسر کا کہنا مانے گی، جو کچھ وہ کہیں گے، وہ کریگی اُن کی کبھی حکم عدولی نہ کرے گی۔ میں کہتا ہوں، وہ دیوی ہے دیوی۔ اور میں یہ بتانا بھول ہی گیا۔ کہ وہ کتنا اچھا گاتی ہے، اور شادی کے بعد جب آپ نے پہلی بار گایا، تو مجھے احساس ہوا کہ آپ بالکل گانا نہیں جانتیں، آواز کیا تھی جیسے مینڈک ٹرا رہے ہیں جو کچھ گنیش داس نے آپ کے

متعلق بتایا۔ وہ سفید جھوٹ تھا، مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ وہ اپنی چیز کو بیچنے کے لیے سودا کر رہے ہیں۔ کاش میں نے تمھیں دیکھا نہ ہوتا، اور تمھاری آنکھوں کی بے حیائی نے مجھے دیوانہ نہ بنا دیا ہوتا۔ تو ــــــ

عورت ۔ تو اُلو بننے کی کیا ضرورت تھی۔ جب شادی کی رسومات ادا ہو رہی تھیں، تو آپ کہہ دیتے ۔ کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کیا میں نے ہاتھ جوڑے تھے، کیا میں آپ کے پاؤں پڑی تھی، یا آپ جیسا خوب رُو لڑکا ہندوستان میں نایاب تھا۔ میں نے شادی کر کے کیا حاصل کیا۔ پہلے گھر میں برتن صاف کرتی تھی، اب یہاں دن رات بجو کے بیل کی طرح کام کرتی ہوں، وہاں بھی محنت کرنی پڑتی تھی، یہاں بھی مزدوری کر رہی ہوں، آپ نے کون سی رانی بنا کر بٹھا رکھا ہے۔

مرد ۔ کہتی تھیں، میں اکیلی ہوں، آپ دن بھر دفتر میں رہتے ہیں۔ میں یہاں اکیلی کیا کروں، اور جب ساس کو بلایا، تو ہر روز لڑائی۔ ہر روز جھگڑے۔ آج ماتا جی نے یہ کہا، آج ماتا جی نے وہ کہا۔ جب گھر آؤ تو منہ بسورے ایک طرف بیٹھی ہوئی ہیں، پھر ہر روز مجھ سے اس بات کا اعتراف

کراتی ہیں کہ میں ایف ۔ اے پاس ہوں، تہذیب سے تم کوسوں دور ہو ۔ چھوٹے بڑے کا پاس نہیں، جب سانس تنگ، آکر ملی گئی تو پھر وہی رونا ۔ میں اکیلی ہوں جی نہیں لگتا ۔

عورت ۔ آپ کا جی تو لگتا ہے نا ۔ وہی کالی کلوٹی بیہودہ سی عورت، جو ایک دن یہاں بھی آئی تھی آپ کو مل گئی ہوگی، اس لیے آپ اتراتے ہیں، اب یہاں آئے تو پاؤں توڑ دوں، بڑے آئے آزادی کے طلب گار ۔ غیروں کی لڑکیوں سے عشق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی ۔ اور اُس کٹنی کو شرم نہیں آتی ۔ اُس دن یہاں آئی، تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مکان کو دیکھ رہی تھی جیسے چند دنوں کے بعد وہ یہیں آکر رہے گی، میں مر جاؤں گی، لیکن یہاں سے کبھی نہ جاؤنگی اُس کٹنی کو یہاں بھی گھسنے نہ دوں گی ۔ وہ کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو ۔

مرد ۔ تم تو بیوقوف ہو ۔

عورت ۔ جی ہاں ۔ اور میں جو ایک دن آپ کے دوست کے ساتھ سینما دیکھنے چلی گئی، تو آپ جل بھن کر رہ گئے، اور ساری رات پیٹتے رہے، ابھی تک جوڑوں میں

درد ہے۔ (سسکیاں لیتی ہے) وحشی کہیں کے۔ بڑے انسان بنتے ہیں۔ ہم آزادی کے حامی ہیں، عورتوں اور مردوں کے برابر حقوق ہونے چاہئیں، جب آپ کسی لڑکی کے ساتھ سیر کرنے جائیں، تو ہم خاموش رہیں، خون کا سا گھونٹ پیکر رہ جائیں، اور جب ہم کسی سے بات بھی کریں، تو ساری رات ڈانٹ ڈپٹ آنکھیں نکال دوں گا، زبان کھینچ لوں گا، یہ کروں گا۔ وہ کرونگا (سسکیاں لیتی ہے)۔

مرد۔ (کروٹ بدلتے ہوئے) بس رونے لگیں عورت کا آخری ہتھیار رونا ہے، جب اور کچھ نہ بن سکے، تو آنسو گرنے لگتے ہیں لیکن مجھے ان آنسوؤں کی رتی بھر پروا نہیں، میں تو اپنے آپ کو کوستا ہوں۔ کہ میں نے کیوں شادی کی، اور یہ بلا اپنے گلے کیوں ڈال لی۔

عورت۔ شادی کے چند دنوں بعد شادی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، وہ خوشی کا گھروندا آن واحد میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، اس سے تو یہ بہتر ہے کہ عورت شادی نہ کرے، اور کچھ نہیں، لڑکے تو تمھاری طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں پاس سے گزرتے ہیں، ہنستے ہیں، اور پھر کسی کے تصور میں

رات گزر جاتی ہے، وہ تصور کتنا میٹھا، کتنا پُرفریب کتنا رنگین ہوتا ہے، اور اب کیا ہے۔ جب کبھی باہر جاؤ، تو سوامی جی ساتھ ہوتے ہیں، اور ماتھے پر لکھا ہوتا ہے، یہ بیسٹ بک ہے یعنی اس کا مالک اس کے ساتھ ہے، کوئی مسکرا کر نہیں دیکھتا اور کوئی مسکرا کر دیکھے، تو ساتھ والا مسکرانے والے کو گھور کر دیکھتا ہے، جیسے اُس سے کہہ رہا ہے۔ بے شرم دیکھتا نہیں بیسٹ بک ہے، روپیہ پیشگی دے چکا ہوں، خوشیاں مٹ جاتی ہیں، تصورات ٹوٹ جاتے ہیں، اور زندگی بے لذت اور بے کیف ہو جاتی ہے

مرد - اچھا یہ بکواس بند کرو۔ تمھاری صورت دیکھ کر مجھے قے آتی ہے۔ پرماتما کے لیے لیمپ بجھاؤ۔ تاکہ اس منحوس صورت سے چھٹکارا نصیب ہو۔

عورت - اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب کیوں جلاتے ہو، جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔

مرد - میں تمھارے ساتھ نہیں رہوں گا، میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا، میں یہاں نہیں رہوں گا۔

عورت - بھاگ کر کہاں جاؤ گے، میں تمھیں اس کلٹنی کے ساتھ بھاگنے نہ دوں گی، میں خود ابھی مرجاؤں گی،

اور اُسے بھی جان سے مار دوں گی ۔

مرد ۔ تمھیں شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے ۔

عورت ۔ کیا وہ ابھی تک میرے اور تمھارے درمیان شرم کی دیوار حائل ہے لیکن تم کہاں بھاگ کر جاؤگے جہاں بھی جاؤگے میں تمھارے ساتھ جاؤں گی' اور میں صرف اکیلی نہ ہوں گی ۔

مرد ۔ (چونک کر) تمھارے ساتھ اور کون ہوگا ؟

عورت ۔ تمھارا بچہ (سسکیاں لیتی ہے)

مرد ۔ لیکن میرا کوئی بچہ نہیں ہے ۔

عورت ۔ زیرِ لب چند مہینوں کے بعد ــــ

(عورت سسکیاں لیتی ہے اور مرد کروٹ بدلتا ہے اور پھر دونوں خاموش ہو جاتے ہیں) ۔



دیوار

اماں ہمیشہ اسی بات پر جھگڑا کرتیں، کہ تم چھوٹے
بھائی کو کچھ نہیں کہتے ہو، دیکھو نا، کتنا شریر ہوگیا ہے، میری
بات تو مانتا ہی نہیں، اگر کوئی گھر کا کاج کرنے کے لیے کہتی
ہوں، تو فوراً نا کر دیتا ہے، اور پھر باتیں اتنی بلند اور کرخت
آواز میں کرتا ہے، کہ کان پھٹے جاتے ہیں، ارے بابا۔ چلا چلا کر
یا چیخ مار کر بھی کوئی بات کرتا ہے۔ نوکر بچارا کتنا ہی کام کیوں
نہ کرے، آخر وہ انسان ہے، دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتا
ہے، چند چھوٹے موٹے کام تو تمھارے بھائی کو بھی کرنے چاہئیں۔
لیکن اوم یہ سب کچھ سن کر بھی ٹس سے مس
نہ ہوتا تھا۔ اُس کی عمر چودہ سال کی ہوگی، لیکن اس قدر

شریر کہ اس کی حرکتوں سے تو خدا ہی بچائے۔ سینما کا بے حد شوقین، شہر میں کوئی فلم آئے، اوم ضرور اُسے سب سے پہلے دیکھے گا، اور اگر ماں کوئی گھر کا کاج کرنے کے لیے کہتی، تو وہ فوراً چیختا چلاتا، شور مچاتا ہوا گھر سے باہر چلا جاتا۔ اور پھر اکثر کہتا۔ کیا بڑے بھائی کام کرتے ہیں، جو میں گھر کا کام کاج کروں، بڑے تو ساری عمر عیش کرتے رہے، اور جب میری باری آئی، تو سبھی چلانے لگے، سینما نہ دیکھو، شام کو سیر کرنے نہ جاؤ، جیب خرچ کم لو، اونچی آواز میں باتیں نہ کرو۔ بڑوں کا ادب کرو۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، اور سینکڑوں باتیں۔

میں اوم کے اطوار سے سخت نالاں تھا۔ عمر میں میں اوم سے بارہ سال بڑا تھا۔ اور میں چاہتا تھا۔ کہ اوم میری عزت کرے، میری باتوں کو غور سے سنے، لیکن کہاں، اس نے گھر والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ماں اکثر اُسے جھڑک دیا کرتیں، لیکن والد صاحب کے پیار نے اوم کو بالکل بگاڑ دیا تھا۔ اور چونکہ گھر میں سب سے چھوٹا اوم ہی تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی سے لاڈ پیار کیا جاتا تھا۔ یعنی اتنی عمر ہونے کے باوجود اُسے "رومی رومی" پکارا جاتا تھا۔ اور وہ

ہیں، کہ لاٹ صاحب بنے بیٹھے ہیں۔ جب کبھی میں اوم کو برا بھلا کہتا۔ تو فوراً اوم والد صاحب کے پاس جاکر شکایت کرتا۔ اور بس۔ میرا تمام رعب ختم۔ اور وہ ہیں۔ کہ چلا رہے ہیں۔ نوکروں کو جھڑک رہے ہیں، ماں کو ڈرا دھمکا کر کچھر کے لیے پیسے مانگ رہے ہیں۔ بس۔ کچھ نہ پوچھو، گھر میں ہر وقت اُس کی کرتوتوں سے ایک ہنگامہ برپا رہتا۔ ہر شخص اوم کی بدلگامی سے نالاں۔ لیکن اوم کسی کی پروا نہ کرتا تھا

اور پھر ایک دن رانی آئی۔ رانی کی عمر بارہ برس ہو گی۔ لیکن قد نکلتا ہوا تھا۔ وہ اکثر سرگوشیوں میں باتیں کیا کرتی اگر اوم کو چلانے کی عادت تھی، تو رانی نہایت ہی مدھم آہستہ آواز میں باتیں کرتی تھی، کبھی کبھی تو اُس کی آواز سنائی بھی نہ دیتی تھی، جیسے الفاظ گلے میں اٹک کر رہ گئے ہیں۔ صرف ایک مدھم شیریں آواز، اُس کے گلے سے نکلتی، اور اوم اکثر ماں سے کہا کرتا۔ کہ رانی کے گلے کا آپریشن کرانا چاہیے۔ لیکن ماں ہنس کر کہہ دیتی، کہ رانی جب جوان ہو جائے گی۔ تو خود بخود اُس کی آواز ٹھیک ہو جائے گی۔ میں اکثر اوم اور رانی کو اکٹھے کھیلتے

دیکھتا۔ اکثر رانی، اوم کو سرگوشیانہ انداز میں بلاتی، اور اوم چپکے سے بھیگی بلی کی طرح اُس کے قریب چلا جاتا۔ اور دونوں باتوں میں مشغول ہو جاتے، اور میں اوم کو اس طرح خاموش، ساکن، چپ چاپ دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ کہ آخر اس منہ زور لڑکے کو اس چھوٹی لڑکی نے قابو میں کر لیا ہے۔ میں چاہتا تھا۔ کہ اوم کا مذاق اڑاؤں، لیکن میں اوم سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ اور اُس کا بڑا بھائی بھی تھا۔ اس لیے میں نے اوم سے اس بات پر مذاق کرنے سے گریز کیا۔

ہاں میں ان دونوں کی حرکات سکنات کا نہایت غور سے مطالعہ کرتا رہا۔ اب اوم کچھ عرصے سے گھر کا کام کاج کرنے لگ گیا تھا۔ اور ماں بھی اوم کے متعلق کم شکایت کرتیں، میں حیران تھا۔ کہ اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے۔ کہ یہ چڑچڑا تلخ مزاج لڑکا یکایک اس طرح پرسکون اور خاموش ہو گیا ہے اب اوم چلاتا کیوں نہیں، اب اوم گھر کا کام کاج کیوں کرتا ہے، ایک حد تک میں اُس کے چڑچڑے پن کی وجہ جانتا تھا، کیونکہ اوم بچپن سے لے کر اب تک کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہا تھا، کبھی بخار ہے، تو کبھی ٹائیفائڈ ہے، کبھی سر کا درد ہے۔ یا کبھی

پیٹ کا درد شروع ہوگیا۔ اور اِس طرح مختلف اقسام کی بیماریاں حملہ آور ہوتی رہیں، لازمی تھا۔ کہ اوم کی صحت کمزور ہوجاتی اور اُس کا مزاج چڑچڑا اور لہجہ تلخ ہوجاتا۔ لیکن ایک دو سال سے اُس کی صحت اچھی ہورہی، اُس کا قد لمبا ہوگیا تھا، اُس کے جسم پر گوشت آرہا تھا، اُس کے اعضا متناسب ہورہے تھے، لیکن مزاج بدستور چڑچڑا تھا، ہم ہزار جتن کرتے، لیکن اس تلخ مزاجی میں فرق نہ آتا۔ اب رانی کی آمد سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہورہا تھا، اب اوم کی تلخ مزاجی جاتی رہی، اُس کی باتوں میں نرمی آگئی، جس کا عنصر اُس کی باتوں میں سے پہلے مفقود تھا، اب وہ بازار جاتا تھا، اور گھر کے لیے چیزیں خرید کر لاتا تھا، رانی اُسے طرح طرح کی چیزیں لانے کے لیے کہتی، دیکھو کچوریاں اور پکوڑیاں لے آؤ، اوم — اور اوم صاحب جو چھوٹی سی فرمایش پر گرم ہوجایا کرتے تھے، ایک زرخرید غلام کی طرح بازار جارہے ہیں، دیکھو، ملائی کی برف والا باہر کھڑا ہے، دو پیسے کی ملائی کی برف لے آؤ، اور اوم صاحب ملائی کی برف لارہے ہیں، میرے پاس کاپیاں نہیں ہیں، مجھے اسکول کا کام کرنا ہے، ذرا بازار سے کاپیاں لادو، اور اوم صاحب کڑکتی دھوپ میں

بازار جارہے ہیں، اور رانی کے لیے کاپیاں لارہے ہیں، مجھے سائیکل چلانا نہیں آتا، بس دوسرے دن اوم رانی کو سائیکل چلانا سکھا رہا ہے، اور جب رانی اوم کو بلاتی، تو اوم کبھی بلند آواز میں جواب نہ دیتا، چپکے سے اس کے قریب چلا جاتا اور دونوں باتیں کرنے لگتے، دونوں خوش تھے، آپس میں باتیں کرتے، ہنستے، کھیلتے، کودتے، اور اسی طرح اوم کے مزاج میں خوش طبعی خود کرنے لگی، رانی کی چھٹیاں ختم ہوگئیں، اور رانی اپنے گھر چلی گئی۔ ایک سال گزر گیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں آئیں، اس دفعہ اوم رانی کے گھر گیا۔ وہ اکثر بلاس پور چلا جاتا، کیونکہ رانی کے گھر والوں اور ہمارے گھر والوں کے تعلقات اچھے تھے۔ دو تین مہینوں میں اوم نے صرف ایک یا دو خط لکھے، اور وہ خط بھی نہایت مختصر تھے، کہ بلاس پور کی آب و ہوا اچھی ہے، آم بکثرت ملتے ہیں، اور ہم نہر کے کنارے جاکر خوب آم کھاتے ہیں، وہاں ہمارا ایک دو بار لکھا، دو مہینے ہوگئے ہیں۔ اب گھر آجاؤ، لیکن اوم نے دوسرے خط میں اس طرح جواب دیا۔ جیسے اسے والد صاحب کا خط ملا ہی نہیں، ایک دو بار ماں نے مجھے کہا

کہ اوم کو لکھو، کہ وہ آجائے، اتنی دیر پرائے گھر ٹھہرنا مناسب نہیں، میں نے ماں کو بتا دیا۔ کہ میں نے اوم کو جلد لوٹ آنے کے لیے لکھا ہے، لیکن میں نے اوم کو کوئی خط نہ لکھا، کیونکہ میں چاہتا تھا۔ کہ اگر اوم گھر آنا چاہتا ہے، تو اپنی مرضی سے آئے، چھٹیاں ابھی ختم نہ ہوئی تھیں، اور اگر چھٹیاں رانی کے ساتھ گزاری جائیں، تو اس میں کیا برائی ہے۔

دو سال اور گزر گئے۔

ان دو سالوں میں نہ رانی آئی، اور نہ اوم اُن کے گھر گیا۔ اب اوم جوان ہو گیا تھا۔ اس کا قد پہلے سے بھی دراز ہو گیا تھا۔ اگر اُس کے قد کے لمبائی کی یہی رفتار رہی، تو وہ ایک دن چھ فٹ کا جوان ہو گا۔ اُس کا چہرہ پہلے سے لمبوترا ہو گیا تھا، اور باہیں، لمبی لمبی کچھ لٹکتی ہوئیں۔ جھولتی ہوئیں، آگے پیچھے بڑھ رہی تھیں، اُس کی باتوں میں اب پھر چڑچڑا پن عود کر آیا تھا، گو وہ اب سمجھانے کے بعد چپ ہو جاتا تھا، لیکن اکثر وہ چلا کر ہی جواب دیتا تھا فلمیں بدستور اُسی کثرت سے دیکھتا تھا، باتوں میں بلا کی شوخی وہ ہر شخص کا مذاق اُڑاتا، گھر پہ کوئی مہمان آئے، اُس کا

مذاق اڑانے سے کبھی نہ چوکتا، چھوٹی بہن شیلا کو بہت ستاتا اُسے بہت پریشان کرتا تھا، رلاتا تھا، اور کبھی کبھی اُسے پیٹ دیا کرتا تھا۔ یونہی ایک ہلکی سی چپت، اور شیلا بسورتی ہوئی ماں کے پاس جا کر شکایت کرتی، "مجھے اوم نے پیٹا ہے۔" اور ماں کہتی۔ کہ "تم نے اوم کو چھیڑا ہوگا۔" اور اوم چیختا، چلاتا، ماں کے پاس چلا جاتا، اور پھر کہتا، دیکھو ماں، میں شیلا کو کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ میری کتاب پر کچھ نہ لکھا کرو۔ لیکن یہ چوہی ہمیشہ کچھ نہ کچھ میری کتاب پر لکھ دیتی ہے، اور پھر مجھے چڑاتی ہے۔ اور آج میں نے ایک ہلکا سا تھپڑ مارا۔ تو اس نے سارے گھر میں کہرام مچا دیا، اور ماں شیلا کو جھڑکتی، اور کہتی بڑے بھائی کا ادب کرنا چاہیئے۔ اور اوم یہ جواب سن کر سینہ پھیلاتا ہوا، بازوؤں کو ہوا میں اچھالتا ہوا باہر نکل آتا۔ مجھے ان باتوں کو دیکھ کر بہت غصہ آتا۔ میں ماں سے کہتا "کہ آپ نے اوم کو بالکل بگاڑ دیا ہے، اب بچہ تو نہیں، جو اس کی شرارتوں کو نظر انداز کیا جائے، اب تو وہ مجھے گھورتا ہے اور کہتا ہے، کہ میں تم سے لمبا ہو گیا ہوں۔ اور سینے کو پھیلا کر بلند آواز میں باتیں کرتا ہے، اسے رتی بھر شرم

نہیں آتی، چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں، اس سال میٹرک کا امتحان دے گا، آپ ہی سوچیے، ایسے شریر باتونی لڑکے کو کون کالج میں داخل کرے گا۔ ماں یہ باتیں سن کر چُپ ہو جاتیں، اور میری باتوں کو نظر انداز کر دیتیں، اور میں دل ہی دل میں کڑھتا، اور اوم کو کوستا، اور اخیر میں مجھے خاموش ہونا پڑتا۔

ایک ابر آلود شام کا ذکر ہے، ماں نے مجھے بتایا۔ کہ رانی چند روز کے لیے یہاں آ رہی ہے۔ رانی کی آمد کی خبر سُن کر میں چوکنّا ہو گیا۔

اور پھر رانی آئی۔

اُس رانی اور اِس رانی میں فرق تھا۔ تین سال کے عرصے میں رانی واقعی رانی بن گئی تھی، اب وہ سرگوشیانہ انداز میں باتیں نہ کرتی، وہ دبی دبی ہنسی، وہ شرمگیں آنکھیں اب قصۂ پارینہ تھیں، اُس کے اُٹھنے بیٹھنے میں ایک پختگی سی آگئی تھی، اس کے حسن میں ایک نئی دلاویزی آگئی تھی۔ گو وہ بچپن ہی سے کافی خوبصورت تھی؛ لیکن اس تھوڑے سے

عرصے ہی میں اُس کا خفتہ حسن و جمال بیدار ہو چکا تھا۔ اُس کی جلد صاف اور شفاف، جیسے سمندر کی جھاگ، رخساروں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی، آنکھوں میں آسمان کی نیلاہٹ، کمر میں بے پناہ لچک، اور اُس کے نتھنے میں وہ سونے کی تیلی، کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اور بند گلے والی قمیض، جس پر سبز رنگ کے بٹن لگے ہوئے تھے، اُس کے سینے پر کتنے خوشنما لگتے تھے اور کانوں میں سفید آویزے، جو سُرخ کانوں کو چھوتے ہوئے نرم، لچک دار گردن پر جھلملا رہے تھے اُس کا قد یوکلپٹس کے درخت کی طرح لانبا۔ اُس کی آواز میں اُگتے ہوئے شباب کی موسیقی ــــــ اور جسم پر طرح طرح کے رنگوں نے ایک نئی کیفیت پیدا کردی تھی، سفید آویزے۔ سبز بٹن۔ پیازی ڈوپٹہ، لبوں پر شفق کی لالی، سپید سپید گردن پر نیلی رگ پھڑکتی ہوئی، ان تمام رنگوں کے امتزاج نے رانی کو ایک برفانی پرندے رت گلے کی طرح خوبصورت بنا دیا تھا، اور وہ ادھر کی طرف دیکھتی، اور مسکرا دیتی، جیسے وہ ادم سے کہہ رہی ہے۔ دیکھا نا۔ اب بتاؤ، اب کیا کہنا چاہتے ہو، تمھارے خاندان میں کوئی ایسی خوبصورت لڑکی

ہے، میں تمھارے خاندان کی سب لڑکیاں دیکھ چکی ہوں،
سب بھدّی، بدصورت اور بدشکل ہیں، کیوں، میاں، اپنی
صورت شیشے میں دیکھی ہے، کتنے لمبے ہوتے جار ہے ہو،
چھوٹا سا چہرہ، اور کپڑے کتنے بھونڈے سے پہنے ہوئے
ہیں، اگر شکل اچھی نہیں، تو کپڑے اچھے پہنا کرو۔ اور پھر
تمھاری آواز کو کیا ہوگیا ہے۔ موٹی، کرخت، کوّے کی سی
آواز، کیا آج کل بھی چیختے چلّاتے رہتے ہو۔

اوم رانی کی طرف دیکھتا، اور رانی کے حُسن
کا جائزہ لیتا، شاید اوم کو اپنی بدصورتی کا احساس ہوگیا تھا
یا یوں سمجھیے، کہ رانی کے حسن نے اُس کے تخیل کو چکا چوند
کردیا تھا۔ اب جب وہ رانی سے ملتا، تو وہ بجھا بجھا سا رہتا،
کچھ کھویا، کھویا سا۔ بالکل اُسی دیے کی طرح جس میں تیل
تھوڑا سا رہ گیا ہو، وہ جانتا تھا۔ کہ رانی کو اپنے حُسن کا
ضرورت سے زیادہ احساس ہے، لیکن اس احساس سے
متعلق وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا، کہ رانی اُسی
بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرے، رانی اُسی طرح شرارتیں کرے
اُسی طرح سے گوشتیاں کرے، اُسی طرح اُس پر حکم کرے۔

اسی طرح اُسے کہے' جاؤ' کھٹے چنے لے آؤ' ملائی کی برف لاؤ' کاپیاں ختم ہوگئی ہیں' مجھے سائیکل پر چڑھنا سکھاؤ' اور وہ چاہتا تھا۔ کہ رانی اُسی طرح اُس کے کان میں آہستہ آہستہ باتیں کرے۔ رانی کی گرم گرم سانس اُس کے کان سے ٹکرائے اُس کی ہلکی ہلکی ہنسی پھر اُس کے کانوں سے مس ہو' وہ موسیقیت سے بھری ہوئی آواز اُس کے دل کے پردوں کو ایک بار پھر جھنجھنا دے۔ لیکن اب تو بات ہی اور تھی۔ اگر رانی کرسی پر بیٹھتی تو وہ صوفے پر بیٹھ جاتا' اور کتاب لیکر پڑھنے لگتا' اور یوں محسوس کرتا۔ کہ ابھی رانی کرسی سے اُٹھ کر اُس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ جائے گی اور پوچھے گی' کونسی کتاب پڑھ رہے ہو' اور وہ چیخ کر کہے گا' کہ تم دن بدن بڑی حسین بنی پھرتی ہو' لیکن کتاب سے نظر اٹھا کر جب وہ رانی کی طرف دیکھتا' تو رانی کو سینڈل کے تسمے ٹھیک کرتے ہوئے پاتا۔ اُسے یہ دیکھ کر بہت غصہ آتا۔ اگر کوئی خوانچے والا مکان کے پاس سے گزرتا' تو وہ اس بات کا انتظار کرتا رہتا کہ ابھی رانی کچھ کھانے کے لیے کہے گی' اور وہ دوڑ کر خوانچے والے کو بلائے گا' اور رانی کو کھٹے چنے کھلائے گا۔ اور اسی طرح

سوچتے سوچتے وہ کتاب کے دو تین صفحے پڑھ جاتا۔ اور جب آنکھ اٹھا کر دیکھتا، تو رانی کو ماں سے باتیں کرتے ہوئے پاتا۔ تو وہ غصے سے جل بھن جاتا۔ اور دل ہی دل میں کہتا۔ بڑی کمینی ہے۔ اگر رانی اُسے اکیلی مل جائے، تو وہ اُسے پیٹے۔ کہ وہ دوبارہ اس گھر کی طرف کبھی رُخ نہ کرے۔

اس کے بعد میں نے کبھی دونوں کو کبھی اکٹھے نہ دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دونوں کے درمیان کوئی آہنی دیوار حایل ہے۔ جس کو وہ پار نہیں کر سکتے، رانی شیلا سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی، اُسے چھیڑتی، اُس سے مذاق کرتی ماں کو طرح طرح کے دلچسپ لطیفے سناتی اسکول کے اُستانیوں کے متعلق نقلیں کر کے گھر والوں کو ہنساتی۔ اور ماں تو کہتی تھیں، کہ ان تین سالوں میں رانی کی کایہ پلٹ گئی ہے، اب تو بڑوں بڑوں کے کان کترتی ہے، اور کسی کو بات تک نہیں کرنے دیتی۔ لیکن اوم کے آنے پر وہ چپ ہو جاتی تھی۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کوئی فوق الفطرت انسان اُس کی طرف آ رہا ہے۔ اور یکایک اُس کا گلا دبوچ لے گا۔ وہ فوراً سہم جاتی۔ جیسے پرندہ کسی شکاری کو دیکھ کر

سہم جاتا ہے، اور پھر نیم باز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی اور کبھی کبھی مسکرا دیتی، اور پھر فرش کی طرف دیکھنے لگتی ۔ یا کبھی کبھی قمیض کے بٹن درست کرنے لگتی ۔ یہ مسکراہٹ کس لیے تھی ۔ وہ کیوں اوم سے ڈرتی تھی، اور جب اوم گھر میں نہ ہوتا تو اُس کے چہرے پر بشاشت آجاتی ۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگتیں ۔ اُس کی باتوں میں روانی آجاتی ۔ اس کی حرکات میں خود اعتمادی کی جھلک نمایاں ہوجاتی، لیکن اوم کے وارد ہونے پر وہ کچھ گھٹی گھٹی سی رہ جاتی تھی ۔

چھ مہینے اور گزر گئے، رانی کے والد کا خط آیا ۔ کہ رانی کی شادی ہورہی ہے، اُن دنوں گھر میں سے کوئی بھی شادی پر نہ جاسکتا تھا ۔ ماں اور والد بیمار تھے، اور مجھے چھٹی نہ مل سکتی تھی، صرف اوم جاسکتا تھا ۔ لیکن اوم نے شادی پر جانے سے انکار کردیا ۔ اوم نے صاف کہہ دیا، کہ اس کا سالانہ امتحان قریب آگیا ہے ۔ اس لیے وہ شادی پر نہ جاسکے گا ۔

رانی کی شادی ہوگئی ۔

رانی کے والد نے بہت گلا کیا۔ اور خط پر خط لکھے کہ آپ نے اچھا نہیں کیا، آپ میں سے کوئی بھی میری بیٹی کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔ بڑوں کے تعلقات پر آپ نے پانی پھیر دیا۔ اور سو باتوں کا ذکر کیا۔ جو ان موقعوں پر لکھی جاتی ہیں۔ والد صاحب اکثر اوم پر ہی اپنا غصہ نکالتے اور کہتے یہ سب اوم کی شرارت ہے۔ اگر وہ شادی پر چلا جاتا۔ تو کیا حرج تھا۔ بڑا ضدی ہے، اتنی ضد بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر ہم میں سے رانی کی شادی پر کوئی نہیں گیا۔ تو اوم کی شادی پر کون آئیگا یہ تو رشتے کی باتیں ہوتی ہیں۔ آج کل کے لڑکوں کو ان رشتوں سے کیا واسطہ، انھیں کیا معلوم۔ کہ دوستی کس طرح نبھائی جاتی ہے، رشتہ داروں سے کس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے۔ بس کالج کا چکر لگا لیا۔ اور بیہودہ فلمیں دیکھ لیں، اور وقت ضائع کرتے رہے

پھر رانی ایک سال کے بعد ہمارے گھر آئی، رانی اب بھی خوبصورت تھی۔ بھڑکیلے کپڑوں نے اُسے زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا، ہاتھوں پر سونے کی چوڑیاں تھیں، اس نے بند گلے کی قمیض پہنی تھی، اور سر پر سبز رنگ کا دوپٹہ تھا، جس کی

نیلا ہیٹ اُس کی آنکھوں سے ملتی تھی، جوڑے میں گلاب کا پھول لگا ہوا تھا۔ قد و خال میں وہی تیکھا پن تھا کہ ابھی تک سونے کی تیلی چمک رہی تھی، لیکن رانی پہلے سے کچھ گدرا گئی تھی۔

اوم کہاں ہے۔ رانی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ڈرائنگ روم میں ہوگا۔ ماں نے کہا۔

رانی کی نگاہیں ڈرائنگ روم کی طرف مڑ گئیں،

"اچھا تو میں اوم سے مل آؤں" وہ ڈرائنگ روم کی طرف جانے کے لئے اٹھی۔

یہیں بیٹھو۔ میں اُسے بلاتی ہوں، اور ماں نے میری طرف دیکھا۔ اور میں ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ اوم صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

تمھیں ایک خوشخبری سناؤں۔

میں سب کچھ جانتا ہوں۔ اوم نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا۔

"رانی تمھیں بلاتی ہے۔"

میں اسے تانگے سے اترتے دیکھ چکا ہوں۔ اوم جیب میں سے رومال نکال کر پیشانی پونچھنے لگا۔" وہ تمھیں اندر بلاتی ہے۔"

اوم چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ اور پھر اوم نے دبی آواز میں کہا۔ میں اُس سے نہیں مل سکتا۔

پاگل نہ بنو۔

"اس میں پاگل پن کی کون سی بات ہے۔" اُس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ یوں ——" اور میں خاموش ہو گیا۔

اوم فرش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پاؤں کی ایڑیاں ہل رہی تھیں اور انگوٹھے کو دانتوں کے نیچے رکھے ہوئے ناخن کاٹ رہا تھا۔

اُس بیچاری کا کیا قصور تھا۔

تو کیا قصور میرا ہی ہے۔ اوم نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا۔

کون کہتا ہے تمہارا قصور ہے، کم از کم رانی سے مل تو لو۔

رانی کو کہہ دیجیے کہ وہ گھر میں نہیں ہے، اور وہ

اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کمرے میں تیزی سے چلنے لگا۔ اُس کے ہاتھ بھنچے ہوئے تھے۔

میں وہاں سے اُٹھ کر ساتھ والے کمرے میں گیا جہاں رانی ماں سے باتیں کر رہی تھی۔ رانی نے میری طرف دیکھا۔ صرف ایک لمحہ کے لیے اُن آنکھوں میں حزن و ملال کی جھلک دیکھی۔ اور پھر رانی کہنے لگی "اوم نہیں آیا"

"اوم گھر میں نہیں ہے!" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

رانی نے گردن کو ایک طرف جھٹک دیا۔ شاید میری بھرائی ہوئی آواز نے اوم کے پیغام کو رانی تک پہنچا دیا تھا۔ رانی کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئیں، آنسوؤں کے دو قطرے سونے کی چمکتی ہوئی چوڑیوں پر گرے، اور پھیل کر سپید سپید جلد میں جذب ہو گئے۔

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ اوم ننگا تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا گلی کے آخری حصے تک پہنچ چکا تھا۔

میری آواز

پرآن نے مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا "بھئی کسی دن آؤ، آج کل میری بیوی گانا سیکھ رہی ہے۔ میں نے بیوی کو گانا سکھانے کے لیے ایک ماسٹر رکھا ہے۔ تم دیکھو تو سہی کہ ٹریننگ اچھی مل رہی ہے یا نہیں، تم خود ایک اچھے گوئیے ہو مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔

اس وقت تو صرف ہاں کہنے کے سوا اور کچھ کہہ نہ سکا لیکن بعد میں یہ سوچ کر تذبذب میں پڑ گیا کہ میرے دوست کو یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ میں گویا ہوں اور بہت اچھا گاتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں علم موسیقی سے قطعی بے بہرہ ہوں، اور مجھے گانا نہیں آتا یوں تو ہر شخص

گا سکتا ہے، اور گاتا ہے، لیکن وہ گانا جس سے روح کو حال آجائے اور انسان ایک نئی مسرت سے ہم کنار ہوجائے اس سے کوسوں دور ہوں۔ میری آواز بھدی اور بھاری ہے اس میں موسیقیت رتی بھر نہیں، ہوسکتا ہے کہ پران نے مجھے ایام طفلی میں گاتے سنا ہو لیکن اس بات کو آج بیس برس ہو گئے ہیں اور اس دوران میں دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اب مجھے بچپن کا زمانہ آریوں کے زمانے کی طرح پرانا معلوم ہوتا ہے، اور پھر اس مسلسل بھوک اور بیکاری نے میری روح میرے جسم اور میری آرزو کا بری طرح کچومر نکال دیا ہے۔ جب میں گفتگو کرتا ہوں۔ تو گمان ہوتا ہے۔ گویا کوئی مردہ قبر سے بول رہا ہے۔ گو مجھے موسیقی سے کافی دلچسپی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں جب تک انسان کا پیٹ خالی ہے۔ وہ کسی بات سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ زمانے کی چیرہ دستیوں نے مجھے اس بری طرح روندا ہے کہ مجھے گانے اور رونے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔

میں اپنے دوست کے گھر کبھی نہ جاتا۔ اگر میں نے سپلائی کے دفتر میں نوکری کے لیے درخواست نہ دی تھی

آج کل سپلائی کے دفتر میں ہر شخص کو نوکری مل جاتی ہے۔ جنگ کا زمانہ ہے اور اس جنگی دور میں کوئی گریجویٹ بیکار نہیں رہ سکتا۔ نئی دہلی میں یہ مثل مشہور ہے۔ کہ جس شخص کو آج کل نوکری نہیں ملتی اُسے قیامت تک نہ مل سکے گی۔ مجھے سپلائی کے دفتر میں درخواست دیے ہوئے ایک مدت ہو گئی ہے لیکن ابھی تک انٹرویو کا انتظار کر رہا ہوں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں گریجویٹ نہیں کیا میں انسان نہیں ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ اگر ہر شخص کو نوکری مل جائے۔ تو بھوک، بیکاری اور مفلسی کدھر جائیں گی۔ اور اگر بھوک بیکاری نہ رہنے۔ تو یہ نظامِ حکومت نہ رہے۔ یہ سیاست نہ رہے۔ اخلاق کی قدریں اور ہوں گی۔ صاف ظاہر ہے کہ موجودہ سماجی نظام کو بدلنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں۔ اس لیے ان باتوں کو مدِ نظر رکھ کر میں اپنے دوست کے گھر چلا گیا۔ چونکہ وہ سپلائی کے دفتر میں نوکر ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ پر اُن سے اپنی نوکری کے متعلق چند باتیں پوچھوں گا۔ اور بھائی کا گانا بھی سنوں گا جب میں اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ تو وہ حجامت بنوانے جا رہا تھا۔ وہ میرے بڑھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر بولا۔

"کیا حجامت بنوانے چلو گے؟"

"معاف کیجیے۔" پران صاحب، میں حجامت بنوانے نہیں آیا، میں بھائی کا گانا سننے آیا ہوں۔" "اچھا۔ میں بنوالوں۔ تم گانا سنو، تمھاری بھابی ابھی آتی ہی ہو نگی۔" یہ کہہ کر وہ چل دیا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں صرف ایک ہی کرسی تھی۔ جون کا مہینہ تھا۔ گرمی کی وجہ سے جسم پسینے سے شرابور تھا۔ کاش بجلی کا پنکھا ہوتا لیکن اِس دورِ ابتلا میں ایک کلرک سے بجلی کے پنکھے کی توقع سراسر حماقت تھی میں نے جیب سے رومال نکالا اور چہرے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ اتنے میں ایک صاحب اندر آئے۔ اور نہایت بے تکلفی سے چٹائی پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔

"بہن جی کدھر ہیں؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔"

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

"کیا آپ ہی گانا سکھاتے ہیں؟" میں نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں"۔ اور وہ مسکرانے لگے۔ پھر وہ ہنس پڑے۔ اور اپنے میلے دانتوں کو نمائش کے لیے پیش کیا۔ سوا اس کے کہ یہ ابھی اپنے دانتوں کو نمائش کے لیے پیش کرتا۔ اور کیا کر سکتا تھا۔ ماسٹر صاحب کہنے لگے۔ آپ کون ہیں۔ کہاں نوکر ہیں۔ کیوں آئے ہیں۔ کیسے آئے اور کب آئے اُن کے سوالات کو سن کر میں کچھ گھبرا گیا۔ لیکن پھر دل کو ڈھارس دیتے ہوئے بولا۔ آپ کہاں سے آئے ہیں کہاں رہتے ہیں۔ اور کیوں رہتے ہیں۔ میرا جواب سن کر وہ جھینپ گیا۔ لیکن جلد ہی وہ مسکرانے لگا۔ شاید مسکرانے کے سوا اسے اور کچھ نہ آتا تھا۔ ماسٹر صاحب کی شکل نہایت بھونڈی تھی چہرے پر موسیقیت نام کو نہ تھی۔ ہاں نحوست اور سنجاست برستی تھی۔ دانت اور مسوڑھے پان کھا کھا کر میلے اور گندے ہو گئے تھے۔ چہرے کے خدوخال بری طرح مسخ ہو گئے تھے اور جب کبھی وہ قہقہہ لگاتے تو چہرے کی ہیئت عجیب ہو جاتی تھی۔ جب باتیں کرتے تھے تو چہرے پر بے شمار شکنیں پڑ جاتیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ موسیقی کی دیوی نے اچھی طرح بدلہ لیا ہے۔ کہنے لگے "آج کل ٹیوشنوں کا بہت زور ہے

کھانا کھانے کے لیے وقت نہیں ملتا۔"
جی ہاں ٹھیک ہے آپ صاف کیوں نہیں کہتے
کہ کھانا ہی نہیں ملتا۔
"بابو صاحب موسیقی نہایت ہی اچھی چیز ہے
لیکن راگ ودیا کو سکھانے کے لیے ایک بات کا خاص خیال
رکھنا چاہیئے۔"
"وہ کیا" میں نے چونک کر کہا۔
"راگ سکھانے والے کا چال چلن اچھا ہونا
چاہیئے۔ بابو صاحب!" اس نے اپنے خشک اور باسی لبوں
پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اور پھر مسکرانے لگا۔ میں اس کے
چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ تاکہ اس کے چہرے کا اچھی طرح
جائزہ لے سکوں۔ ماسٹر صاحب کے گال اندر دھنس چکے
تھے۔ اور پیشانی پر بہت سی جھریاں تھیں۔ آنکھوں کے نیچے
سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اور لبوں پر ایک سیاہ رنگ کی
پپڑی جمی ہوئی تھی۔ اس کے حلیے سے صاف عیاں تھا کہ
وہ ساری عمر کوٹھوں کی سیر کرتا رہا ہے۔ اور اب جب زندگی
کا سرمایہ لٹ چکا ہے۔ تو اس نے گویوں کے لئے یہ سنہری

اصول گھڑ لیا ہے۔ مجھے اس اصول سے خاص دلچسپی نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے۔ موسیقی اور تجرّد ـــــ یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ ابھی یہ باتیں میرے دماغ میں گشت کر رہی تھیں کہ دوست کی بیوی آگئی۔ ایک ہندوستانی عورت کی طرح کچھ کچھ شرماتی۔ لجاتی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئی، وہ ابھی باتھ روم سے نہا دھو کر نکلی تھی، سر کے بال گیلے تھے۔ اس نے سفید ساڑھی باندھی تھی جس پر زرد رنگ کا کنارا لگا ہوا تھا۔ وہ بہت خوبصورت نہ تھی۔ لیکن بدصورت بھی نہیں کہ اُسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کی شکل و صورت سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ شادی سے پہلے کافی خوبصورت ہوگی اور مجھے اپنے دوست کی بات یاد آگئی۔ کہ وہ کس طرح شملہ کی صاف شفاف سڑکوں پر اپنی ہونے والی بیوی کا تعاقب کرتا رہا۔ اکثر سڑکوں پر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ وہ اس کے لانبے لانبے بالوں کو دیکھ کر کتنا خوش ہوا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد یہ سیاہ بال اس کی ملکیت ہوں گے۔ یہ موٹی موٹی آنکھیں جن پر سیاہ پلکیں جھکی ہوئی ہیں چند مہینوں کے بعد صرف اُس کی طرف

دیکھا کریں گی۔ لیکن شادی کے بعد کیا ہوا کلرک کے بے رحم ہاتھوں نے حسن کو بری طرح جھنجھوڑا۔ وہ دل کشی، وہ جاذبیت وہ رعنائی، جاتی رہی۔ وہ مسکراہٹ جس کو دیکھ کر اُس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔ آج بے جان اور بے کیف ہو گئی تھی۔ وہ نرم، ملائم، سرخ ہونٹ کہاں گئے۔ ان کی جگہ اب پتلے، سوکھے لبوں نے لے لی تھی اب وہ موٹی موٹی آنکھیں کچھ کچھ اداس غمزدہ غمگین اور کھوئی کھوئی رہتی ہیں۔ چہرے کی چمک اور دلآویزی جاتی رہی، آواز میں نقاہت اور کمزوری لیکن ان باتوں کے باوجود یہ کوشش کی جا رہی تھی کہ زندگی میں دل کشی رہے اگر جسمانی دل کشی معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ تو گانا سیکھ کر روح کے لیے نئی غذا تیار کی جائے لیکن مصنوعی غذا سے کچھ نہیں ہوتا۔ اور پھر میرا دوست یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر گانے کے ساتھ اسے ناچنا بھی آ جائے تو خوب لطف رہے گا۔ وہ ایک اور ماسٹر کی تلاش میں تھا۔ جو اُس کی بیوی کو ناچ سکھا سکے۔ گانا اور ناچ یہ دونوں چیزیں متوسط طبقے کی لڑکیوں کے لیے لازمی قرار دی گئی ہیں دونوں فن اپنی اپنی جگہ نہایت عمدہ اور موزوں ہیں۔ اور

ان دونوں کو سیکھنے کے لیے وقت چاہیے وقت اور روپیہ ایک کلرک کے پاس اتنا روپیہ کہاں اگر پیٹ کاٹ کر ان چیزوں سے حظ اٹھایا جائے، تو اس کے نتائج نہایت خوفناک ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ میرے دوست کو گانے اور ناچ سے خاص رغبت ہو، ہو سکتا ہے میرے دوست کی بیوی کو گانا سیکھنے کا خاص شوق ہو۔ لیکن وہ حالات کہاں، وہ ماحول کہاں اگر صبح سے لیکر شام تک گھر کا کام کاج کیا جائے، برتن صاف کیے جائیں، فرش دھویا جائے، روٹی پکائی جائے۔ بچوں کے کپڑے سیے جائیں۔ تو پھر ناچ اور موسیقی کے لیے کہاں وقت مل سکتا ہے اور اگر وقت مل سکتا ہے، تو اتنی سکت کہاں ہوتی ہے۔

اور یہی حال ہماری بھابی کا تھا۔ ماسٹر صاحب نے ہارمونیم اُن کی طرف کر دیا۔ اور بھابی نے ہارمونیم پر انگلیاں پھیرنی شروع کیں ادھر ماسٹر صاحب نے گانا شروع کیا اور پھر آہستہ آہستہ بھابی نے شرماتے ہوئے اپنے زرد لب کھولے اور ماسٹر کی آواز میں اپنی آواز ڈھکیل دی اور پھر دونوں آوازیں کمرے میں گونجنے لگیں ہم تینوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ کیا

ہو رہا ہے۔ تینوں سُر مختلف تھے۔ نہ بھابی کے گلے کے سُر باجے سے ہم آہنگ تھے۔ اور نہ ماسٹر کی آواز باجے سے ملتی تھی۔ اور طرّہ یہ کہ جب تینوں آوازیں اکٹھی نکلتیں تو میں یہ سوچنے لگتا کہ موسیقی کہاں ختم ہوتی ہے۔ رونا کہاں شروع ہوتا ہے۔

آخر میں نے شور وغل سے تنگ آکر کہا "آہستہ گائیے ماسٹر صاحب"۔

وہ میری طرف دیکھنے لگا اور پھر مسکرانے لگا آپ نے دانتوں کے ساتھ مسوڑھے بھی نمائش کے لیے پیش کیے میلے دانت پہلے ہی کیا کم تھے۔ مسوڑھوں کی نمائش نے تو مجھے بالکل برانگیختہ کر دیا اور اب تو یہ حالت تھی کہ ارد گرد کے مکانوں سے لڑکیاں باہر نکل کر میرے دوست کے دروازے پر آگئی تھیں اور نہایت اشتیاق سے اس انوکھی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں ماسٹر صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے۔ اور بھابی کا سانس پھول گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار تھے۔ اور ہونٹ اس ورزش کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔ اگر بھابی کا سانس پھول نہ جاتا تو موسیقی تا قیامت جاری رہتی وہ تو ہانپ کر چپ ہو گئی لیکن ماسٹر صاحب ہارمونیم بجاتے رہے۔ اور میری طرف اس طرح دیکھتے رہے جیسے وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ صاحب ابھی تک آپ نے ایک تعریفی جملہ بھی نہیں کہا۔

اتنے میں پران بھی آگیا۔ اور مجھے کچھ ڈھارس ہوئی۔ وہ حجامت کرا کے آیا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ حجامت اس کی نہیں ہوئی بلکہ میری ہوئی ہے۔

"سناؤ بھائی گانا کیسا رہا" اس نے میرے کندھوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا" بہت اچھا کیا بتاؤں ماسٹر صاحب بھی کیا کہوں آج آپ نے کمال کر دیا" اور پھر ماسٹر صاحب چلا اٹھے ارے یہ کیا" دیکھا تو ان کی شلوار بھیگ گئی تھی۔ ارے پانی کہاں سے آیا۔ پران نے چونک کر کہا۔

"صبح فرش دھویا تھا شاید کچھ پانی رہ گیا ہو" اور بھابی ہنسنے لگی اور پھر ہم چاروں نے یکبارگی قہقہہ لگایا۔ جب ماسٹر صاحب چلے گئے تو پران کہنے لگا" سناؤ یار تمہاری کیا رائے ہے۔ بھابی کی آواز کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ اور ماسٹر کی قابلیت کے متعلق"

میں کچھ عرصہ خاموش رہا اور اپنے دوست کے خیال پر غور کرتا رہا۔ اگر میں صاف گوئی سے کام لوں تو میرے دوست کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اور اگر ماسٹر صاحب کے خلاف کچھ کہوں تو بیچارہ بھوکا مر جائیگا میں نے بھابی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پیلا ہو گیا تھا۔ اور چہرے کی رگیں ابھر آئی تھیں اس کے گال کچھ اندر پچکے رہتے تھے اور

آنکھوں کے گرد سلوٹیں پڑ رہی تھیں اور میں نے دل میں سوچا کہ بھابی کو نہ تو موسیقی کی ضرورت ہے اور نہ ہی ناچ کی انہیں تو اچھی خاصی مقوی غذا ملنی چاہیے اگر صبح و شام تازہ پھل ملیں تو حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ پھر خیال آیا کہ اگر بھابی پھل کھانے لگیں تو ماسٹر صاحب کیا کھائیں گے۔

"بھئی بتاؤ تو سہی میری بیوی کیسا گاتی ہے" پران نے بچوں کی طرح منہ بسورتے ہوئے کہا۔ اب اس کے سوا کہ میں اپنے دوست کی بیوی کے گانے کی تعریف کرتا اور کیا کر سکتا تھا۔ میں نے جی کھول کر بھابی کے گلے کی تعریف کی اور ماسٹر کی قابلیت کے پل باندھ دیئے میرا دوست میری طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگا جیسے اس کے سامنے تان سین یا باجو باورا بیٹھا ہوا ہو اور پھر مسکرا کر اپنی بیوی کے زرد چہرے کی طرف دیکھنے لگا تعریف کے چند جملوں نے بھابی کے چہرے پر ایک سرخ لہر سی زندہ کر دی تھی لیکن بھوک اور نقاہت کی وجہ سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"تو کبھی کبھی آیا کرو اور بھابی کا گانا سنا کرو" پران نے کہا۔ میں نے سر ہلا دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ آج کل میں سوچتا رہتا ہوں۔ کہ اپنے دوست کو کس طرح کہوں کہ اس کی بیوی کو موسیقی کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ وٹامن کی ——

کاش وہ بیوقوف ہوتا

وہ خود نہیں جانتا تھا۔ کہ اُس میں کس بات کی
کمی تھی۔ وہ کیوں ایک غلط راستے پر کئی برسوں سے گامزن ہے
اگر اُسے اس بات کا احساس ہوتا۔ کہ وہ ایک غلط راستے پر
چل رہا ہے تو وہ ضرور اپنے اطوار بدل لیتا۔ اکثر اس کی ماں
نے اُسے کوسا تھا۔ کہ وہ ایک خاموش، بے حس، بے جان سا
لڑکا ہے، اُس کی بول چال میں عورت کا سا شرمیلا پن ہے
وہ کیوں ایک گوشے میں ایک نئی نویلی دلہن کی طرح خاموش
پڑا رہتا ہے۔ ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے زندگی میں
حرکت کی ضرورت ہے۔ وہ لوگوں سے کیوں نہیں ملتا، آخر
کب تک اُس کے والدین اُس کی مدد کریں گے۔ وہ اکثر ماں کی

گھرکیوں کو سنتا ۔ اور چپ ہو جاتا ۔ اور ماں اپنی باتوں کا جواب نہ پاکر خوب کڑھتی ۔ اور چیخ چلاکر سمجھ لیتی ۔ کہ لڑکا بیوقوف ہے ۔ شاید اس کا ذہن ناکارہ ہے، شاید وہ ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتا ۔ لیکن وہ اپنی ماں کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا

وہ اچھی طرح جانتا تھا ۔ کہ وہ لوگوں سے کیوں نہیں ملتا، اُسے لوگوں سے مل کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی، اور وہ اکثر خاموش رہتا، وہ جانتا تھا ۔ کہ اس خاموشی کے خول کو توڑ کر وہ بے محور ہو کر رہ جائیگا ۔ یہی اُس کی قلمرو تھی، اگر اُس نے اس قلمرو کو بھی برباد کر دیا ۔ تو اُس کے پاس کیا رہے گا ۔ اُسے محسوس ہوا ۔ جیسے اس خاموشی سے اسے محبت ہے، اتنی محبت جس کا وہ اظہار نہیں کر سکتا ۔ اگر وہ ماں کو اس خاموشی کے متعلق کچھ بتادے، تو کیا وہ ان باتوں کو سمجھ جائے گی ۔ جب کبھی وہ اکیلا ہوتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ خاموشی اپنی نرم انگلیوں سے اُس کے سر کے بالوں کو سہلا رہی ہے ۔ وہ بستر پر ایک بے جان بت کی طرح بیٹھا رہتا، اور خاموشی کی ان گنت گہرائیوں میں کھو جاتا اُس وقت اُسے کتنی مسرت حاصل ہوتی، جیسے خوشیوں کا منبع اعظم اور مسرت کی لہریں اُس کی رگ رگ میں سما رہی ہیں

وہ دنیا و مافیہا کو بھول جاتا۔ اور آنے والے واقعات سے بے رخی
کا اظہار کرتا۔ کمرے میں اکیلا پڑا رہتا۔ خاموشی اُس کے چاروں طرف
رینگتی اُوپر، نیچے، دائیں، بائیں اور کتنا ہی عرصہ اس سردی نشہ
میں گزر جاتا۔ اور جب وہ آنکھیں کھولتا، تو کمرے میں مکھیوں کے
بھنبھنانے کی آواز آتی۔ وہ گردن کے نیچے سے ہاتھ نکالتا،
اور لوہے کی چارپائی پر ہاتھ رکھ دیتا۔ گرم گرم ہاتھ جب لوہے
کی سرد پٹی پر پڑتے، تو اُس کی آنکھیں سردی اور ٹھنڈک سے
کھل جاتیں، وہ ایک جمائی لیتا، اور ٹانگیں پھیلا کر بستر پر
دراز ہو جاتا۔ لیکن آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں، اور اُس کی
نظریں روشندان کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے گزر کر باہر کی فضا
میں گھوم جاتیں، وہ اس چھوٹے سے جھروکے سے بیرونی زندگی
کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ اس سوراخ سے سبز پتوں کو دیکھ سکتا
تھا۔ جن پہ سورج کی کرنیں رقصاں تھیں، وہ آسمان اُس نیلے
حصے کو دیکھ سکتا تھا۔ جو پتوں کی اوٹ میں نہ تھا۔ ہرے ہرے
پتے کسی دیہقانی لڑکی کی طرح آنکھ مچول کرتے، لیکن اُس کے
ساتھ ہی ایک گلا سڑا پتا اُس کی طرف جھانک کر دیکھتا، اُسے
اِس گلے سڑے پتے کو دیکھ ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ پتا اُس کی

زندگی کی ترجمانی کر رہا ہے، پھر ہوا کا تیز جھونکا آتا اور یہ گلاسڑا پتا سبز پتوں کی اوٹ میں آجاتا، اور کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ گلا سڑا پتا ٹہنی سے الگ ہوگیا ہے۔ اُس کے گرنے کی آواز اس کے کانوں میں آتی، اور اس کے سارے وجود میں ایک جھرجھری سی آجاتی، لیکن جلد ہی کسی کے کدال چلانے کی آواز آتی، تو اُس کا ذہن اس کی آواز کی طرف منعطف ہو جاتا۔

دو دن سے مزدور کدال چلا رہا تھا۔ اور اس نے مکان کے اردگرد کی گھاس کو صاف کر دیا تھا۔ صبح ہوتے مزدور اُس کے پاس آیا تھا۔ اور اُس نے اپنا کام دکھلانے کے لیے مجبور کیا تھا۔ واقعی زمین پر گھاس کا نام و نشان نہ تھا لیکن اب زمین زیادہ گندی اور بھدّی معلوم ہوتی تھی۔ جگہ جگہ گھاس کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اور پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نہایت بدنما دکھائی دیتے تھے، کیا گھاس کاٹنے سے مکھیاں کم ہوجائیں گی! اُس نے سوچا۔ اور مزدور کی طرف دیکھنے لگا جیسے اُس سے جواب طلب کرنا چاہتا ہے۔ مزدور اُس کی طرف حیران نظروں سے دیکھنے لگا۔ دراصل وہ اپنے کام کی داد چاہتا تھا۔ اُس نے دو دن میں کتنا کام کیا تھا۔ اُس نے مزدو

سے پوچھا "چائے پیو گے؟" مزدور نے جواب دیا "چائے" اُس
نے حسین کو آواز دی، اور کہا۔ کہ "مزدور کو چائے پلاؤ" اُس
نے سوچا وہ انسان ہے، اُسے انسانوں سے ہمدردی ہے۔
لیکن مزدور نے حسین کا نام سنتے ہی چائے پینے سے انکار
کر دیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ مسلمان کے گھر کی چائے نہیں
پیتا۔ لیکن وہ تو خود بھی ہندو ہے۔ اُس نے سوچا "تو کیا ہوا
بابو جی، آپ کا باورچی تو مسلمان ہے" وہ غصے سے لال پیلا
ہو گیا۔ اُس کا جی چاہتا تھا۔ کہ اس مزدور کو دھکے دے کر
مکان سے باہر نکال دے، کدال لے کر اس کے سر کو چیر دے
اتنی خوبیوں کے باوجود اوہام کی رگیں ابھی تک ترو تازہ ہیں
کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا۔ شاید اُس کی باتیں کوئی بھی
نہیں سمجھ سکتا۔ اُس نے سوچا۔ خاموشی ان باتوں کی بہترین دوا
ہے۔ لیکن اس خاموشی کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اُس کی
ماں نے اُسے کوسا تھا۔ وہ کیوں چپ سا رہتا ہے، بالکل ایک
گدھ کی طرح، جو درخت کی اونچی ٹہنی پر بیٹھ کر فضائی تنہائیوں
میں کھویا رہتا ہے، وہ لوگوں سے باتیں کیوں نہیں کرتا۔ کیا
مزدور انسان نہیں ہوتے، اُس نے اس مزدور سے باتیں

کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مزدور کا جواب سن کر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ اُن بڑھوں سے مل کر کچھ حاصل نہیں۔ مزدوروں نوکروں چماروں میں بیٹھ کر انسان کچھ نہیں سیکھ سکتا۔

اس کی ماں ہمیشہ کہا کرتی تھی "تم نوکروں سے بہت پیار کرتے ہو۔ یہ چھوٹے لوگ بہت کمینے ہوتے ہیں بڑوں میں بیٹھ کر آدمی بڑا آدمی بنتا ہے۔ بیٹا اس شرمیلے پن کو چھوڑ دو بڑوں سے ملنا سیکھو!" وہ ان باتوں کو سن کر گھبرا جاتا۔ دور سے خاموشی کی نرم نرم لہریں اُس کی طرف بڑھتیں، اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتیں اور وہ بستر پر بے سکت اور بے جان ہو کر گر پڑتا۔

آج اُس کا بھائی اُسے کہہ رہا تھا "ایسے کام نہیں چلے گا۔ آخر کب تک میں تمہاری مدد کروں گا۔ ماں باپ کی باتوں کو تم نے رد کر دیا۔ اور تم نے اپنی زندگی سنوارنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ تمہاری کالج کی زندگی اتنی نکمی اور ناقابل بیان ہے کہ اس کا دہرانا میری اپنی ہتک ہے۔ تم ایف۔ اے میں دو بار فیل ہوئے اور بی۔ اے میں تین بار۔ اور جب تم نے

ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنی چاہی، تو تم جان بوجھ کر بیمار
ہو گئے، میں جانتا ہوں، تم اُن دنوں بالکل بیمار نہ تھے، آخر کالج
میں دو سال ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ اگر ایم۔ اے میں دو سال
ضائع کئے تھے۔ تو کم از کم ایم۔ اے کی ڈگری تو لے لیتے۔ میں
تمہارے بارے میں اتنا پریشان اور ایک تم ہو۔ کہ ان باتوں
کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے، شاید تم میری مجبوریوں کو نہیں
سمجھتے، زندگی کا راستہ کٹھن ہے۔ بہت کٹھن ۔۔۔۔ محنت
کرنی پڑتی ہے، خون پانی ایک کرنا ہوتا ہے، کامیابی یوں حاصل
نہیں ہوتی، کالج کی پڑھائی کے بعد تم نے کیا کیا؟ تم ہمیشہ
نوکری سے دور بھاگتے رہے، کاش تم کسی آفس میں کلرک ہوتے
آخر تم کیا چاہتے ہو؟ تم کلرکی سے کیوں دور بھاگتے ہو؟ بس تم
عملی زندگی سے کنارہ کشی کرنا چاہتے ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں
آتا۔ کہ تم کیا چاہتے ہو!"

وہ باتیں سنتا رہا اور بچھے ہوئے قالین پر ہاتھ
پھیرتا رہا۔ قالین اون کے دھاگوں سے بنا ہوا تھا۔ نہایت نفیس
اور ملائم اون تھی، کشمیری بھیڑوں کی اون نہایت ہی ملائم
معلوم ہوتی ہے، اور کبھی کبھی عورتوں کے بالوں سے زیادہ

نرم و نازک"۔۔۔۔ اُس کی نظریں قالین کے ایک سرے سے پھسلتی ہوئی دوسرے سرے تک چلی گئیں۔ سرخ، سبز، نیلی پیلی اون۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسی قالین پر قوسِ قزح کے تمام رنگوں کا اجتماع ہوگیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اون کے اُبھرے ہوئے دھاگوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اور اپنے بھائی کی باتیں سنتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کے بھائی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے۔ کیا اُس کی خاموشی کا خول ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائیگا۔

اُس کا بھائی کہہ رہا تھا "تم میری طرف نہیں دیکھتے ؟ میں دن رات کام کرتا ہوں، صبح سے لیکر شام تک دفتر میں قلم گھسنا ہوں۔ رات کو ٹائپ کرتا ہوں۔ اور جو وقت بچتا ہے، وہ لڑکوں کو پڑھانے میں صرف کرتا ہوں۔ صرف یہی نہیں روزانہ اخباروں کے لئے مزاحیہ مضمون لکھتا ہوں۔ آخر اسی طرح تو میں بالائی آمدنی حاصل کرتا ہوں۔ اگر میں تمھاری طرح چپ بیٹھا رہتا۔ تو آج فاقے کرتا۔ اور ساتھ ہی تم بھی۔ لیکن تمھارے کان پر تو جوں تک نہیں رینگتی"۔

بھائی نے اُس کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ ان باتوں کا جواب چاہتا ہے۔ لیکن وہ خاموش تھا، اُس کا ایک ہاتھ قالین

پر تھا۔ جس کے لمس سے وہ محظوظ ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں ٹوٹے ہوئے روشندان سے باہر کی چیزوں کا جائزہ لے رہی تھیں، مکھیاں بھنبھنا کر بجلی کے تار پر سوگئی تھیں، باہر درختوں کے پتّوں پر بارش کے قطرے آہستہ آہستہ پڑ رہے تھے۔ سڑا گلا ہوا پتّا اور گل گیا تھا، اور ٹہنی سے جدا ہونا چاہتا تھا۔ مزدور کدال چلا رہا تھا۔ کبھی کبھی ساتھ والے مکانوں سے بچّوں کے رونے کی آوازیں آتیں، یا کوئی نوجوان لڑکی کوئی فلمی گیت گاتی۔ تو وہ چونک پڑتا۔ مزدور کے کدال چلانے کی آواز برابر آتی رہتی، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ مزدور کام کرتا رہے گا۔ صبح سے لیکر شام تک، دور الارم کے بجنے کی آواز آتی، مزدور بدستور کام کرتا رہا۔ شاید وہ ساری عمر کام کرتا رہے گا۔ اور اُس کی زندگی کی کدال اسی طرح چلتی رہے گی۔

بھائی کا دوست کہنے لگا " میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے، کہ تم بہت خاموش رہتے ہو، آخر یہاں پڑے پڑے کیا کرتے ہو، کیا تمہارا جی اس کمرے سے نہیں اُکتاتا۔ آخر اس کمرے میں کیا ہے، آخر اس بستر میں کیا ہے، جو دن رات اس سے چمٹے پڑے رہتے ہو۔ اور جانے کیا کیا باتیں سوچتے ہو

اگر زندگی میں کامیابی چاہتے ہو، تو کچھ کام کرو۔ میں کہتا ہوں رمیش کی طرف دیکھ لو۔ چند دن ہوئے یہاں آیا تھا۔ اُسے کوئی بھی نہیں جانتا یہاں۔ اس کے باوجود وہ لوگوں سے ملنے گیا۔ اگر ایک جگہ نوکری نہیں ملی، تو دوسری جگہ گیا۔ اور وہاں سے نامراد آیا تو تیسری جگہ گیا۔ شبیر علی کے گھر وہ دس بار گیا ہوگا آخر وہ بھی تو تمھاری طرح ہی انسان ہے۔ اور پھر اتنی دوڑ دھوپ کے بعد اُسے جگہ مل ہی گئی۔ راجندر کو دیکھ لو۔ شاید میٹرک پاس بھی نہیں، بالکل ڈفر ہے ڈفر۔ لوگوں سے ملتا ہے انھیں اپنی کہانیاں سناتا ہے، کیا ہوا کہ اُسے ابھی تک نوکری نہیں ملی، رجب علی نے اُس سے وعدہ کیا ہے، کہ وہ اُسے اپنی کمین گاہ میں جگہ دے دیگا۔"

"وہ راجندر کی طرح بیوقوف نہیں ہے، ہاں وہ راجندر کی طرح ڈفر نہیں ہے۔" اُس نے دل میں سوچا یہی الفاظ وہ اپنے بھائی سے کہنا چاہتا تھا، لیکن اُس کا گلا بھر گیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوکھا مڑا پتا اُس کے گلے میں اٹک گیا ہے، لیکن بھائی نے شاید یہ الفاظ سن لیے تھے۔

"کاش تم بھی بیوقوف ہوتے۔" اُس کا بھائی

یہ کہہ کر دفتر کو چل دیا۔ وہ دیر تک اس فقرے پر غور کرتا رہا۔ اس فقرے میں زہر کی تلخی تھی، یہ الفاظ سنتے ہی اس کا دماغ چکرا گیا، اس نے محسوس کیا۔ کہ ساری زمین پر پھر گھاس اُگ آئی ہے۔ مکھیاں کمرے میں پھر بھنبھنانے لگی تھیں۔ اور مزدور زور زور سے کدال چلا رہا تھا۔ بچے چیخنے لگے تھے، اور لڑکی چیخ چیخ کر فلمی گیت گا رہی تھی "مجھے پریشوور" اس نے سوچا اس کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہوئے، آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اس نے آنسوؤں کو، پلکوں سے باہر نہ نکلنے دیا۔ وہ کچھ نہیں کہے گا، اس نے سوچا۔ "وہ اس خاموشی کے خول کو کبھی نہ توڑے گا۔ یہی اس کی زندگی کا بھید ہے، وہ اس راز کو کبھی افشا نہ ہونے دیگا" لیکن بھائی کے فقرے نے اسے بری طرح گھائل کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج خاموشی کا ہالہ ٹوٹ جائے گا۔ اور اس کی زندگی کا آخری سرمایہ بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اگر اس کی محبوب خاموشی نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا، تو پھر وہ کیا کرے گا۔ کیا وہ واقعی نکما ہی ہے، کیا اس نے زندگی میں کوئی جد و جہد نہیں کی، کیا اس نے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں سوچا؟ کبھی نہیں

سوچا! کیا اُس کی زندگی یونہی بیکار اور بے مصرف رہے گی!!

شاید یہ بات نہ تھی، اُس نے اِس چھوٹی سی زندگی میں بہت کچھ سیکھا تھا۔ جس کا علم اُس کے بھائی کو نہ تھا۔ اور وہ اپنے بھائی کو بتانا بھی تو نہ چاہتا تھا۔ ہاں یہ درست تھا۔ کہ وہ لوگوں سے بہت کم ملتا، اُن سے کم گفتگو کرتا، اکثر اُن کی باتوں کا ہاں یا نہ میں جواب دیتا، لیکن وہ لوگوں کی موجودگی کو محسوس کرسکتا تھا۔ اُن کی ہر حرکت، ہر بات کا تجزیہ کرسکتا تھا کہ فلاں آدمی نے اُسے کیوں دعوت دی، فلاں آدمی کیوں مسکراکر آگے بڑھ گیا۔ فلاں اُس کے پاس روز کیوں آتا تھا، فلاں نے کیوں اُسے چائے پر بلایا۔ فلاں نے اُس کی سفارش کیوں نہ کی۔ یا فلاں نے اُسے آفس میں جگہ کیوں نہ دی، وہ انسانوں کی کمینگی سے کافی آگاہ ہوچکا تھا۔ وہ قدم قدم پر زندگی کے ہر نقطے پر انسانی کمزوریوں کا احساس کرسکتا تھا۔ اور اگر آج اُس کے بھائی نے اُسے بیوقوف یا ڈفر کہہ دیا۔ تو وہ اس فقرے کے نفسیاتی پس منظر کو سمجھ سکتا تھا۔

آخر ان سالوں میں اُس نے کچھ تو سیکھا تھا۔ ان ستائیس سالوں میں اُس نے کیا سیکھا تھا۔ شاید اس کا جواب تھا خاموش رہنا، خاموشی کی لہریں پھر اُس کی طرف بڑھنے لگیں، اور آہستہ آہستہ پاؤں سے ہوتی ہوئی دماغ کی طرف سرک گئیں، لیکن آج ایک لفظ 'بیوقوف' نے اُس کے دماغ میں آگ سی بھر دی تھی، برسوں کا سویا ہوا ذہن یکایک جاگ اُٹھا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اُس نے زور سے قالین کے اُبھرے ہوئے اونی دھاگوں کو پکڑ کر روشندان سے جھانکنا چاہا سبز سبز پتوں پر بارش کے قطرے یوں تیر رہے تھے، جیسے اُس کی پلکوں میں آنسو، 'زندگی آنسوؤں کی پھلجھڑی ہے'! اُس نے سوچا، یہاں غم زیادہ ہے اور خوشی کم، کبھی کبھی ہوا کا جھونکا آتا، اور پتوں کے ہلنے سے نیلے آسمان کا ٹکڑا اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتا۔ ٹوٹے ہوئے روشندان سے سورج کی الوداعی شعاعیں لرزتی کانپتی اندر آتی گئیں۔ اُنھوں نے پہلے سامنے کی دیوار کو چوما۔ دیوار پر گلوریا کی تصویر لٹک رہی تھی کرنوں کے پڑتے ہی تصویر مُسکرا اُٹھی، کرنیں آہستہ آہستہ میز کی طرف بڑھیں، پھر کتابوں پر گر پڑیں، کتاب کا ٹائٹل کرنوں کے

پڑتے ہی جگمگا اٹھا' میں نے سات عورتوں سے محبت کی' ٹانگیں بستر پر لیٹے ہوئے نوجوان کی طرف گھور کر دیکھنے لگا کرنیں مسکراتی ہوئی الماری کی طرف بڑھیں۔

یہ کرنیں وینشنگ کریم کے ڈبے سے آنکھ مچولی کھیلنے لگیں۔ دانتوں کا برش مسکرانے لگا۔ کرنیں وہاں سے ہوتی ہوئی کیل سے ٹنگے ہوئے سرخ بلاؤز پر آبیٹھیں' وہ بالکل اُس بچے کی طرح پیاری اور معصوم لگتی تھیں' جو ماں کی گود میں بیٹھ کر مرے ہوئے باپ کی یاد دلاتا ہو۔ یہ بلاؤز گلوریا کا ہے' اُس نے سوچا۔ اُسے گلوریا سے محبت ہے؟ بالکل نہیں۔ بلکہ گلوریا اُسے چاہتی ہے! اُسے گلوریا سے محبت نہیں ہوسکتی' صرف پیار ہوسکتا ہے' ایک قسم کا اُنس۔ یا یوں کہو' کہ گلوریا کو وہ پسند کرتا تھا۔ بالکل اُس سرخ نکٹائی کی طرح' جو اُس نے ٹرنک میں چھپا رکھی تھی' لیکن اُس کے بھائی کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ گلوریا کو پسند کرتا ہے' اور گلوریا اُسے چاہتی ہے' اور جب کبھی وہ گلوریا کو خط لکھتا ہے' تو وہ فوراً آجاتی ہے' اکثر وہ گلوریا کو ملنے جاتا تھا۔ اور اُسے یہ بار بار محسوس ہوتا تھا کہ گلوریا اس کی بیوی ہے' گلوریا بالکل کنواری تھی مگر وہ بالکل

ایک ہندوستانی بیوی کی طرح اس کی خاطر دارات کرتی تھی وہ روپیوں کا بٹوا گلوریا کے حوالے کر دیتا تھا۔ تاکہ گلوریا کو یہ محسوس ہو جائے، کہ اُسے گلوریا پر کتنا بھروسہ ہے، اور جب کبھی وہ باہر سیر کرنے جاتا، تو گلوریا ہمیشہ پانچ کا نوٹ اُسے دیتی، اور کہتی، "بس اور نہیں ملیں گے" وہ زیادہ روپیوں کے لئے چلاتا رہتا، گو دل میں وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کہ زیادہ روپے یہاں خرچ نہ ہوں۔ تو اچھا ہی ہے۔

اگر اُس کے کپڑے میلے ہو جاتے، تو گلوریا رات کو اُس کے کپڑے دھوتی، اُس کے بوٹوں کو پالش کرتی اُس کی پھٹی ہوئی قمیصوں کو سیتی۔ ان میں بٹن لگاتی، اتنا خیال تو اپنی بیوی بھی نہیں رکھتی اور گلوریا تو ایک کنواری عورت تھی، وہ صرف اُس سے محبت کرتی تھی، اور وہ اس کے بالوں سے کھیلتا تھا، اُس کے حسین، گداز جسم سے اس سے اپنے آپ کو محفوظ کرتا تھا، گلوریا کا سینہ کتنا خوب صورت تھا۔ وہ اُسے پسند کرتا تھا، وہ بھی اُس کے پاس آتی تھی، اس کے ساتھ کئی کئی ہفتے رہتی تھی، وہ اُسے گالیاں دیتا تھا اور وہ گالیوں کی پروا نہ کرتی تھی، اُسے صرف

اس بات کا اندیشہ تھا، کہ کوئی اور لڑکی اُس کے عاشق سے محبّت کرنے لگے، اِس لئے گلوریا نے اپنا نوکر اس کے گھر بھیج دیا تھا، اور جب کبھی گلوریا اُس کے پاس آتی تو نوکر اکثر گلوریا کو اِدھر اُدھر کی باتیں سناتا، کہ فلاں دن صاحب نے تین عورتیں منگائی تھیں۔ فلاں دن ایک لڑکی صاحب سے ملنے آئی تھی وہ یہ باتیں سن کر جل بھن جاتی، بگلی گلوریا۔ اُس سے ناراض ہو جاتی، وہ اُسے گالیاں سناتا اور خوب پیٹتا۔ "سالی مجھ پر اعتبار نہیں کرتی، نوکروں کی باتوں پر اعتبار کرتی ہے، بہت کمینی ہے تو، اس لئے تو میں تیرے ساتھ شادی نہیں کرتا۔" اکثر گلوریا اُسے شادی کے لئے کہا کرتی تھی، اور وہ اُس کی باتوں کو سن کر مسکرا دیتا۔ "خاموشی"، اُس نے سوچا۔ "ہر مرض کا بہترین علاج ہے۔"

جب کبھی وہ باہر جاتا تو اکیلا ہوتا مگر اکیلا ہو کر بھی وہ اکیلا نہ ہوتا۔ اُس وقت اس کی زندگی دو حصوں میں بٹ جاتی، اور وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا،

جاہل ، بیوقوف ۔ ہمیشہ بیوقوف اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں، اُسے بچپن سے اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت تھی، اُسے یاد ہے کہ جب وہ پہلی یا دوسری جماعت میں پڑھتا تھا، تو اسکول سے واپس آکر وہ ایک اجاڑ، ویران سی جگہ کا رُخ کرتا، اور سنگ ریزوں کو اکٹھا کرکے اُن سے باتیں کرتا، کوئی اُس کا دوست بن جاتا، کوئی دشمن کسی کو مارتا، کسی کو پیار کرتا، اسی طرح شام ہوجاتی، اور اس کے والدین اس کی تلاش میں ادھر آنکلتے ، اُسے پتھروں سے گفتگو کرتے دیکھ خوب ہنستے، اور کہتے لڑکا پاگل ہے ، بیوقوف ہے، اور اب جوان ہوکر بھی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ، اپنی کمزوریوں پر نگاہ ڈالتا، اپنی اچھائیوں کا اندازہ لگاتا ــــ اُس کا بھائی درست کہتا تھا، کہ اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔ جب کبھی وہ اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھتا، تو وہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا، جیسے وہ بالکل اکیلا ہے، وہ اُن لوگوں کی طرح گپیں نہ ہانک سکتا ، وہ چپ چاپ اُن کی باتیں سنتا رہتا۔ حتیٰ کہ وہ اُس کی موجودگی کے احساس سے بے بہرہ ہوجاتے، وہ پھر زور سے

کھانستا، یا یونہی زور سے قہقہہ لگاتا۔ تا کہ اُس کے ساتھیوں کو اس کی موجودگی کا احساس ہو جائے۔

اُس کے دوست نہایت ہی عامیانہ قسم کی باتیں کرتے۔ آج فلاں کلرک کی دس روپے ترقی ہو گئی ہے، اندر کے ہاں لڑکا ہوا ہے، بھئی گاندھی نہیں مرنا، نہیں تو ہندوستانیوں کو آزادی مل جاتی، ارے یار جناح پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا اور پھر بھی بچ گیا۔ ہندوستانیوں کی قسمت میں غلامی لکھی ہوئی ہے،۔۔۔ اتحادیوں کی حالت بہت نازک ہے، انھوں نے سسلی پر کوئی قبضہ نہیں کیا، یہ محض پروپگنڈا ہے، جرمنی نے ایسے خطرناک ہتھیار بنائے ہیں کہ اتحادیوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔۔۔ جوگندر نے مسلمان نوکر رکھا ہوا ہے، بڑا ہندو بنا پھرتا ہے، سپلائی کے دفتر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے، ہندو تو ڈرپوک ہیں ڈرپوک ۔۔۔ دیو دت کی بیوی کے متعلق کچھ سنا۔ بڑی بنی ٹھنی رہتی ہے، یار چال غضب کی ہے، سینہ یوں ابھار کر چلتی ہے، کہ خدا کی پناہ، ارے او لنکار کے ساتھ اُس کا تعلق ہے، خاوند بھی تو کچھ نہیں کہتا، لیکن تم کیوں جلتے ہو، بیوی اس کی ہے، اور وہ

اپنی بیوی کو جس طرح چاہے رکھے، جس کے ساتھ اس کی مرضی ہو وہ بھیجے گا۔ اس کا خاوند تو ایسا ہی ہے ــــ یہ جنگ بھی ختم نہیں ہوتی، روپے کا دو سیر آٹا ملتا ہے ــــ اور اگر جنگ ختم ہو گئی۔ تو ہم پھر کیا کریں گے، روپے کا دو سیر آٹا بھی نہیں ملے گا، بناسپتی گھی اصلی گھی سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے ــــ دنیا بھر کی باتیں، وہ دوستوں کی باتیں سنتا رہتا اور خاموش رہتا۔

وہ بھائی کی ناراضی کا باعث بھی جانتا تھا، یہ محض اقتصادی الجھن تھی۔ اگر وہ اُن کی جگہ ہوتا، تو پھر اسی طرح اپنے چھوٹے بھائی کو جھڑکتا، اکثر اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو اسی طرح کوسا تھا، اس دنیا میں انسان اور کس پر غصّہ نکالے، بڑا بھائی تو حق بجانب تھا، وہ کئی برسوں سے ایک بڑے کنبے کو پال رہا تھا، وہ چاہتا تھا، کہ اس کا چھوٹا بھائی کہیں نوکر ہو جائے، تو کم از کم گھر کا نصف خرچ تو سنبھال لے، آخر وہ کب تک خون پانی ایک کر کے ان لوگوں کو کھلاتا رہے گا، اُسے بھی زندہ رہنا ہے، وہ بھی زندگی دیکھنا چاہتا ہے، جب سے اس نے کمانا شروع کیا ہے، اُس کی آمدنی

کا بیشتر حصہ ان لوگوں پر صرف ہو جاتا ہے، اگر وہ صرف اکیلا ہوتا تو کس ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا۔ محنت وہ کرے اور کھائیں دوسرے! اُس نے کنبے کو پالنے کا کوئی ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔ بڑے بھائی کا غصّہ جائز ہے، لیکن وہ بھی بیوقوف نہیں، اگر وہ بیوقوف ہوتا، تو کب کا نوکر ہوگیا ہوتا، اور اگر وہ نوکر ہوگیا ہوتا، تو اُسے ان باتوں کا کس طرح پتہ چلتا، اُس نے اس بیکاری کے زمانے میں بہت کچھ سیکھا تھا۔ اور اب ماسوا خاموشی کے اُس کے پاس کچھ نہ تھا، یہی اُس کی زندگی کا سرمایہ تھا۔

آج اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا وہ چاہتا تھا، کہ اِس خاموشی کے ہالے کو ہمیشہ کے لئے توڑ دے اور اس روشندان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، تاکہ بیرونی منظر اُس کی آنکھوں میں سما جائے، وہ روشندان سے کود کر باہر نکل جائے گا۔ وہ بھائی سے چھپ کر بھاگ جائے گا، اس ماحول میں کتنا زہر ہے، اس کی زندگی میں کتنی تلخی ہے، اس کا سانس گھٹا جاتا تھا، اب وہ اس کمرے میں نہیں رہ سکتا، اب اُس کی روح ٹکڑے ٹکڑے

ہو چکے ہیں، وہ ضرور اس روشندان کو توڑ دے گا، اس نے پتھر اٹھایا۔ اور روشندان پر دے مارا۔ روشندان کا شیشہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ ہرے ہرے پتے اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ اور ہوا زور زور سے چلنے لگی، مزدور ابھی تک کدال چلا رہا تھا، سورج کی کرنوں سے پتھروں کے ٹکڑے چمک اُٹھے تھے، اُس نے ٹوٹے ہوئے روشندان سے اپنا ہاتھ باہر نکالا، ہوا اُس کے ہاتھوں کو تھپکیاں دینے لگی اور اُس کی انگلیوں سے سرسراتی ہوئی نکل گئی، اُس نے سوچا، وہ محسوس کر سکتا ہے، ہوا اُس کی انگلیوں سے مس ہو رہی تھی، لطیف نرم و نازک، بالکل گلوریا کے ریشمی بالوں کی طرح، بالکل گلوریا کے اُبھرے ہوئے سینہ کی طرح، بالکل گلوریا کے نازک، پتلے، سرخ، اور لذت سے چور لبوں کی طرح ——— وہ محبت کر سکتا ہے، وہ مزدور کے کدال چلانے کی آواز سن سکتا ہے۔ پگلی لڑکی ابھی تک گا رہی ہے، وہی فلمی گیت ——— تارے ہیں میرے زخمِ جگر ان میں سما جا، وہ کچن میں بھنے ہوئے گوشت کی

خوشبو سونگھ سکتا ہے، اس کے حواسِ خمسہ بالکل درست ہیں، وہ بیوقوف تو نہیں ہے —— نہیں، نہیں وہ بالکل بیوقوف نہیں ہے۔

کاش وہ بیوقوف ہوتا!

